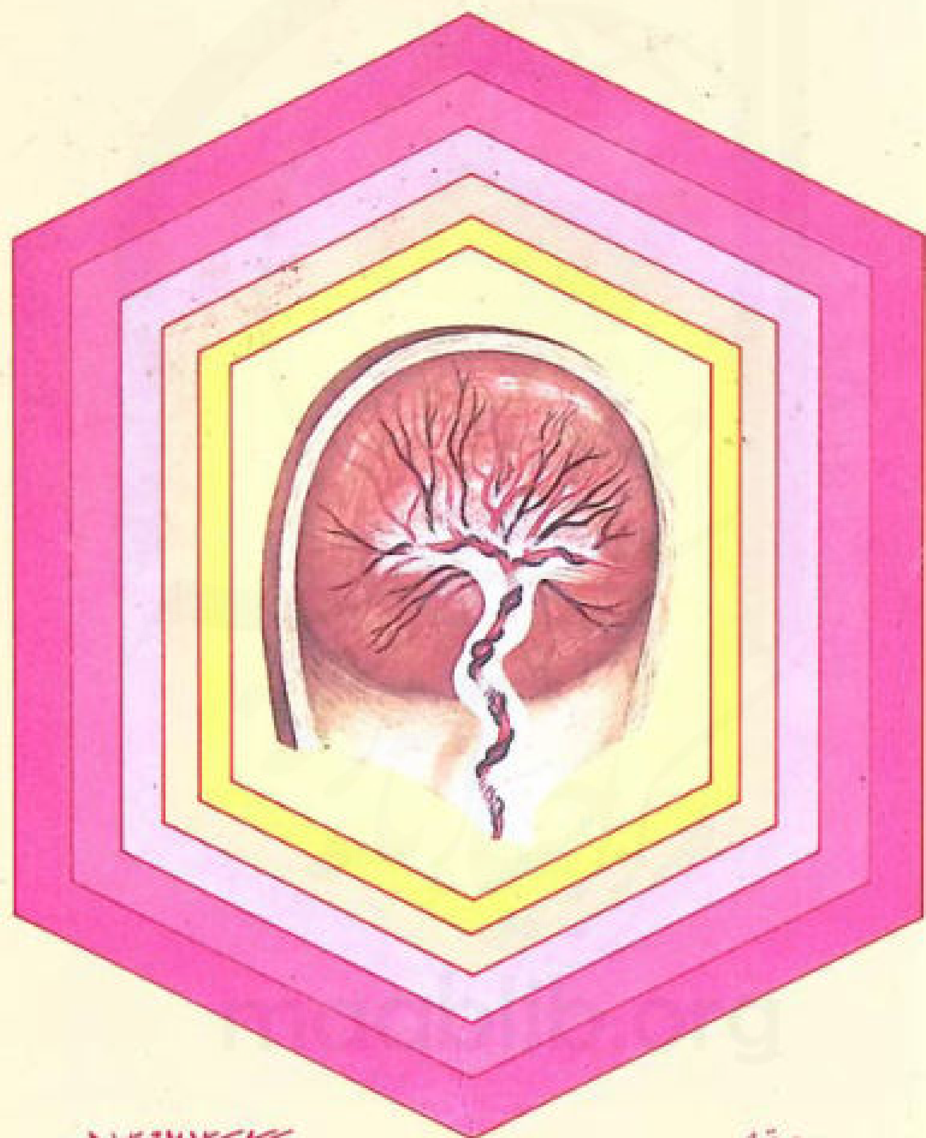
حیاتِ انسان کے چھ مرحلے



مرتبہ
السید جواد الحسینی آل علی الشاہرودی

مجمع جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

حیات انسان کے چھ مرحلے

مرتبہ

السیّد جواد الحسینی آل علی الشاہرودی

مترجمہ

پروفیسر علی حسنین شیفتہ

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس ۵۳۲۵ کراچی نمبر ۲

تالیف	السید جواد الحسینی آل علی الشاہرودی
ترجمہ	پروفیسر علی حسنین شیفتہ
اصلاح و نظر	کاظم علی گجراتی
کتابت	اشرف راحت
طباعت	شاہین پیکجز کراچی

طبع ثانی ۱۹۸۹ء ۱۴۰۹ھ

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیماتِ اسلامی دُنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اِس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اِس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسول ؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اُردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۸۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچے بچیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

دُعا ہے کہ خداوندِ منّان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

تعاون کا طلبگار:

(شیخ) یوسف علی نفسی نجفی

وکیل حضرت آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی

اسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بُنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدد ندیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اُصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اُصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمھارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو اس کے مُعتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اِسے اس کا مناسب مقام دو۔

امام علی علیہ السلام

فہرست

عرض مؤلف	۹
پہلا مرحلہ ـــــــ عالمِ ذرّ	۱۱
انسان میں دینی احساس	۱۴
دوسرا مرحلہ ـــــــ عالمِ اصلاب	۲۱
وراثتی صفتیں	۲۴
اسباب طفرہ	۲۶
تخلیق جنین میں خوراک کا اثر	۲۸
جماع کے لیے مکروہ اوقات	۳۱
جماع کے لیے مستحب اوقات	۳۸
تیسرا مرحلہ ـــــــ بطنِ مادر	۴۰
آیات کریمہ	۴۱
خلیہ سے حیات جنین کی ابتدا	۴۲
احادیثِ مقدسہ	۴۶
مسئلہ بداء	۵۳
چوتھا مرحلہ ـــــــ عالمِ دنیا	۶۳
مادی گروہ	۶۳
روحانی گروہ	۶۴
تکامل حیات کی راہ	۶۶
تکامل ذات	۶۷

تکاملِ ذات کی مثال ۶۸
حضرت سلیمانؑ کا زہد و قناعت ۷۱
تکاملِ حقیقی کا راز ۷۴
پانچواں مرحلہ ——— عالمِ برزخ ۷۵
مثالی جسم ۷۶
عالمِ برزخ میں احساس لذت والم ۷۷
عالمِ برزخ کے وجود پر استدلال ۷۸
روایات و احادیث سے استدلال ۸۲
دلیلِ اجماع ۸۵
حکماء خدا شناس کے اقوال ۸۶
دلیل عقلی ۸۷
مومن کے لیے روزِ حشر سے پہلے کی سزا ۹۱
سوال منکر و نکیر ۹۲
مُردوں کو منتقل کرنے والے فرشتے ۹۳
ملائکہ نقالہ کا ایک قصہ ۹۵
سیّد نعمت اللہ جزائری کا ارشاد ۹۸
فشارِ قبر ۹۹
قول حضرت مفیدؒ ۱۰۲
حقیقتِ موت ۱۰۳
عذاب قبر ۱۰۷
تخفیف عذابِ قبر ۱۱۰

میت کے لیے دوسروں کے اعمالِ خیر ۱۱۴
اپنے مُردوں پر رحم کرو ۱۱۷
زیارت رفتگاں ۱۱۹
چھٹا مرحلہ ـــــــ معاد ۱۲۴
معاد کے خوفناک احوال ۱۲۵
نظریۂ قیامت اور عقل ۱۳۰
عدل دلیل معاد ہے ۱۳۴
مخبرین صادقین نے قیامت کی خبر دی ہے ۱۴۱
مشاہدہ سب سے بڑی دلیل ہے ۱۴۲
ابراہیمؑ کے لیے مُردوں کا زندہ ہونا ۱۴۵
قیامتِ کبریٰ ۱۴۸
علامات و شرائط قیامت ـــــــ رجعت ۱۴۹
یاجوج وماجوج ۱۵۹
کچھ اور علامتیں ۱۶۰
نفخ صور ۱۶۳
اقتدار صرف خدائے واحد کا ہے ۱۶۴
تعقل قیامت ۱۶۸
عمرو بن معدی کرب کا واقعہ ۱۶۹
قیامت کی خوفناک حالتیں ۱۷۰
دِل اُچھل کر حلق تک آجائیں گے ۱۷۴
تقویٰ لباس قیامت ہے ۱۷۶

پچاس ہزار سال کا دن ۱۷۸
لکھنے والے دو فرشتے ۱۸۱
خاتمہ ۱۸۷
وہ لوگ جو فزعِ اکبر سے محفوظ رہیں گے ۱۸۷
حُبِّ اہل بیتؑ فزعِ اکبر سے بچاتی ہے ۱۸۸
حُبِّ اہل بیتؑ قیامت میں خوف سے امان دلانے والی ہے ۱۹۴
اہل بیتؑ اور اُن کے محبوں کی فضیلت ۲۰۲
شفاعت اہل بیتؑ ۲۰۸
کون شافع اور کون مشفوع ہیں ۲۱۰
صراط ۲۱۶
پل صراط سے گزرنا ۲۱۷
اعراف اور طفل و مجنوں ۲۲۰
کفار کے ناسمجھ بچّے ۲۲۲
حقیقت جنّت ۲۲۵
خلقت جنّت و جہنّم ۲۲۸
جنّت اور اُس کی نعمتیں ۲۳۱
جنّت کا کھانا پانی ۲۳۲
لباسِ جنّت ۲۳۴
قصرہائے جنّت ۲۳۶
جہنّم اور اُس کے متعلقات ۲۳۷
توبہ ۲۴۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مؤلف

قوموں کی نشوونما میں تربیت وتہذیب کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے تاکہ وہ اخلاقِ حسنہ سے متصف ہو کر دنیا و آخرت میں سعادت حاصل کر سکیں پس بچہ معاشرے کی تعمیر میں اس پہلی اینٹ کا مقام رکھتا ہے جسے اگر حُسنِ تربیت کے ذریعے صحیح طور پر رکھا جائے تو ساری عمارت صحیح و مستقیم رہتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی بلند و عظیم ہو۔

جس طرح بیج مناسب زمین اور مناسب آب و ہوا میں مناسب نگہداشت کا محتاج ہوتا ہے اور جس طرح معمار اپنی تعمیر کی سلامتی اور مضبوطی کے لیے صحیح اوزان و پیمائش کا محتاج ہوتا ہے، بالکل اسی طرح بچے کے لیے بھی اس کے مختلف میلانات و رجحانات اور اس کی مختلف طاقتوں کے درمیان توازن و اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بھی مناسب نشوونما کے لیے مناسب ماحول کا محتاج ہوتا ہے۔

مناسب تربیت کی سب سے پہلی ذمہ داری والدین کے کاندھوں پر ہوتی ہے، کیونکہ گھر ہی بچّے کا سب سے پہلا مدرسہ ہوتا ہے اور والدین اس کے سب سے پہلے معلّم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ہر بچّہ فطرتِ صحیحہ پہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر اُس کے والدین کبھی اسے یہودی بنا دیتے ہیں تو کبھی نصرانی!"

یہ کتاب ایک ناچیز سی کوشش ہے جسے میں فرزندانِ اسلام کی خدمت میں اس عام جدّوجہد میں شرکت کے خیال سے پیش کر رہا ہوں جو مفکّرین اور تربیت کنندگانِ امّت کی طرف سے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جاری ہے کہ ہماری نئی نسل کی تربیت دینِ اسلام کے مطابق ہو اور ہمارے نوجوان اپنی عظیم ثقافت سے آراستہ ہوں۔

میں نے اس کتاب میں ان چھ مرحلوں کا ذکر کیا ہے جن سے کتاب و سنّت کی تصریح کے مطابق وجودِ انسانی کا گزر ہوتا ہے۔ نیز اس کے آخر میں جنّت و جہنّم کے بارے میں بہ عنوان خاتمہ ایک اور باب بھی شامل ہے۔

دُعا ہے کہ خداوند کریم میری اس کوشش کو قبول فرمائے اور نوجوانانِ ملّت کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اسلام کی تعلیمات سے بیشتر واقفیت پیدا کریں اور ان پر عمل کریں کہ اسی میں ہم سب کی فلاح مضمر ہے۔

(السیّد جواد الحسینی آل علی الشاہرودی)

عالمِ ذرّ

جاننا چاہیے کہ ہر وہ انسان جو اس دنیا میں آیا ہے وہ یقیناً چھ مرحلوں سے گزرا ہے۔ جن میں سے پہلا مرحلہ عالمِ ذرّ یعنی وہ مرحلہ ہے جب انسان ننھے ننھے ذرّات کی حالت میں تھا۔ پروردگارِ عالم نے اس مرحلے کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

"اور اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں میں سے اُن کی ذرّیت کو لیا اور اُن سے اُن کے اپنے نفسوں پر گواہی دلوائی کہ کیا میں تم سب کا رب نہیں ہوں؟" تو اُن سب نے کہا کہ "ہاں، ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہی ہمارا رب ہے۔ اللہ نے یہ اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس حقیقت سے غافل تھے یا یہ کہو کہ ہمارے آباؤ اجداد نے پہلے ہی سے شرک اختیار کیا تھا

اور ہم اُن کی اولاد تو بعد میں ہوئے۔ لہٰذا ہم نے اُن کی پیروی کرلی۔" (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۷۲۔۱۷۳)

پروردگار نے یہ بات اس لیے فرمائی ہے کہ حجّت تمام ہونے اور امکانِ علم کے بعد کوئی عذر قابلِ قبول نہیں رہتا۔ پس مقصد خداوندی یہ تھا کہ ہر شخص کو اُس کے اپنے نفس پر گواہ بنا کر اُس سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرالیا۔ جیسا کہ آیت ۱۷۳ سے ظاہر ہوتا ہے کہ "تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ تم اس حقیقت سے غافل تھے۔" یا یہ کہہ سکو کہ "ہمارے آباؤ اجداد نے شرک اختیار کیا تھا۔ اُن کے بعد ہم اُن کی اولاد ہوئے تو اے اللہ کیا تو ہمیں باطل پرستوں کے عمل پر ہلاک کردے گا؟"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اندھی تقلید کرنے والوں کے مذکورہ دونوں عذروں کو اللہ نے اس طرح باطل کردیا کہ عالمِ بشریت میں آنے سے پہلے ہی اُن سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرالیا اور اُس کے متعلق اُن سے عہد لے لیا۔ لہٰذا اگر انسان کی فطری صلاحیتوں کو والدین وغیرہ کے ہاتھوں مسخ نہ کیا جائے تو وہ یقیناً خدائے واحد کا اقرار کرے گا۔

پس مذکورہ بالا آیتوں سے ہم یہ نتیجہ تو نکال سکتے ہیں کہ اللہ نے اولادِ آدمؑ میں سے ہر ایک کو خود اُس کے نفس پر گواہ بنایا اور اپنی ربوبیت کا اقرار کروالیا۔ لیکن ان آیتوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ یہ اقرار کیسے اور کہاں لیا گیا۔

ان امور کے بارے میں جو تفسیری روایات وارد ہوئی ہیں اُن میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بعض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے یہ اقرار حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کے وقت ان ذرّات سے کروایا جو صلبِ حضرت آدمؑ میں تھے اور بعض سے یہ کہ ان ذرات سے اقرار لیا جو مٹی میں تھے جس سے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا

اور تمام اولادِ آدم کے ذرّات اس میں شامل تھے۔ یہ ذرّات اللہ کی قدرت سے فہم و شعور رکھنے والے اور قابلِ خطاب تھے، جیسا کہ اللہ کے کلام سے ظاہر ہے کہ اللہ نے کہا: "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا: "یقیناً تو ہے۔" اس سوال و جواب کے بعد وہ ذرّات دوبارہ اپنی سابقہ حالت کی طرف لوٹ گئے۔ اسی وجہ سے اِس حالت کو "عالمِ ذر" کہا جاتا ہے۔[1]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ یہ اقرار لینے کی جگہ یہی دنیا ہے اور یہ دونوں آیتیں خلقتِ انسانی کے بارے میں اُس سنّتِ الٰہیہ کی جانب اشارہ کرتی ہیں جو ابتداہی سے جاری ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ انسان کی ذرّیت کو صلبِ پدر سے رحمِ مادر کی طرف لاتا ہے اور پھر وہاں سے اسے اس دنیا میں پیدا کرتا ہے۔ ان ساری کیفیات میں اللہ اسے اپنی قدرت اور وحدانیت کے آثار دکھاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے جیسا کہ بعض تفسیروں میں ہے کہ وہ ذرّات اور نطفے جو اصلابِ پدر سے نکل کر ارحامِ مادر میں داخل ہوتے ان میں بصیرت و ادراک کی وہ قابلیت و صلاحیت موجود تھی جو اللہ نے انسان میں ودیعت فرمائی تھی اور یہی فطرتِ صحیحہ و سنّتِ الٰہیہ ہے۔ لہٰذا پروردگارِ عالم کا سوال بھی بزبانِ حال تکوینی تھا اور ذرّات کا جواب بھی بزبانِ حال تکوینی ہی تھا اور اس طرح کی تعبیریں عرفِ عام میں اکثر پائی جاتی ہیں جیسا کہ بعض ادیبوں کا قول ہے:

"زمین سے پوچھو کہ تیرے دریاؤں کو کس نے جاری کیا، تیرے درختوں کو کس نے اگایا اور تیرے پھلوں کو کس نے

---

[1] تفسیر المیزان سورۂ اعراف

پکارا؟ اگر وہ زبانِ قال سے جواب نہیں دے گی تو کم از کم زبانِ حال سے ضرور بتائے گی۔"

یا جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"پس اللہ نے آسمان و زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے آؤ تو دونوں نے کہا: ہم خوشی سے آتے ہیں۔"

(سورۂ فصلت۔ آیت ۱۱)

پس آسمانوں اور زمین کا یہ جواب زبانِ حال سے ہی تو تھا۔

انسان میں دینی احساس

بہر طور یہ ایسا میثاق ہے جسے ہر انسان اپنی ذات و فطرت میں محسوس کرتا ہے اور اپنے وجود میں اس کے آثار کو سمجھتا ہے۔ محققین نے بیان کیا ہے کہ دینی احساس اور حسِ معرفتِ خالق انسان کے اصلی احساسات میں سے ہے اور یہی احساس انسان کو اس کی پوری زندگی میں اپنے خالق کی معرفت کے لیے ابھارتا رہتا ہے۔ جس کی بنا پر اس کے لیے حق سے انحراف اور منحرف باپ دادا کی جاہلانہ تقلید میں کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ نورِ اسلام ہمیشہ ہی روشن رہا ہے۔ خواہ اس کے خلاف کتنا ہی پروپیگنڈہ کیوں نہ کیا گیا ہو اور صحیح اسلامی تبلیغ چاہے کتنی ہی کم رہی ہو۔ کیونکہ حق کی طرف رغبت دلانے کا جذبہ انسان میں ذاتی و فطری طور پر پایا جاتا ہے اور یہ جذبہ اتنا ہی قوی ہوتا ہے کہ یہ اس کو انکشافِ حقیقت پر ابھارتا رہتا ہے اور یہ حقیقت وہ صحیح اسلام ہے جو ہر زمانے میں انسان کی سعادت کا ضامن ہے اور "یہی وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے انسان کو خلق فرمایا ہے۔"

(سورۂ روم۔ آیت ۳۰)

متفق علیہ حدیث میں آیا ہے کہ "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی و نصرانی بنا دیتے ہیں۔" اس حدیث شریف میں والدین کا خصوصی ذکر اس لیے آیا ہے کہ اکثر بچے والدین ہی کے دین پر پرورش پاتے ہیں اور اسی سے محبت کرتے ہیں۔ (سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۳۷۳)

پس معلوم ہوا کہ انسانی وجود کا پہلا مرحلہ عالمِ ذر ہے یا انسان کے بارے جاری ہونیوالی سنتِ الٰہیہ کا عالم ہے۔ صحیح تو یہ ہے کہ انسان سے اقرار لینے کا یہ واقعہ اس دنیا میں نہیں بلکہ عالمِ ذر میں پیش آیا۔ جیسا کہ اس کی تائید میں بہت سی احادیثِ متواترہ موجود ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

(۱) عبید اللہ حلبی نے امام باقر و امام صادق علیہما السلام سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اپنی خلافت کے پہلے سال عمر بن خطاب حج کو چلے، جبکہ مہاجرین و انصار نیز امام علیؑ بھی حسن و حسین علیہما السلام اور عبد اللہ بن جعفر سمیت ان کے ہمراہ تھے۔ جب عبد اللہ احرام باندھ کر آئے تو وہ سُرخ مٹی سے رنگا ہوا ایک ازار اور ایک چادر تھی۔ اس وقت خلیفہ عمر بن خطاب ایک ازار اور ایک چادر اوڑھے تلبیہ پڑھتے ہوئے امام علیؑ کے پہلو میں چل رہے تھے۔ ان کی نظر عبد اللہ پر پڑی تو اپنے پیچھے کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: احرام میں یہ کیا بدعت ہے؟

تب امام علیؑ نے اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا: "اے عمر! کسی کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ ہم لوگوں کو سنّت کی تعلیم دے۔"

عمر نے کہا: "اے ابوالحسنؑ! آپ نے سچ کہا، لیکن قسم بخدا مجھے علم نہیں تھا کہ آپ اس سے ناراض ہوں گے!"

راوی کا بیان ہے کہ یہ واقعہ ان کے سفر میں پیش آیا۔ جب وہ لوگ مکہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے بیت اللہ کا طواف کیا۔ خلیفہ عمر نے حجرِ اسود کو

بوسہ دیتے وقت اس کو مخاطب کر کے کہا: "قسم بخدا! مجھے یقیناً معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے جو نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ اگر رسول اللہؐ نے تجھ کو بوسہ نہ دیا ہوتا تو میں تجھ کو کبھی بوسہ نہ دیتا۔ امام علیؑ نے فرمایا: "ٹھہر جاؤ اے ابو حفص! ایسا نہ کہو، یقیناً رسول اللہؐ اس پتھر کو کسی مشخص و معین حکم کی بنا پر چومتے تھے۔ اگر تم قرآن پاک پڑھتے تو تمہیں اسکی حقیقت معلوم ہو جاتی جیسا کہ دوسروں کو معلوم ہے کہ یہ پتھر نفع و نقصان پہنچاتا ہے اور اسکی دو آنکھیں، دو ہونٹ اور ایک فصیح زبان بھی ہے۔ یہ اس شخص کی گواہی دیگا جو صحیح طریقہ سے اس کا حق ادا کرے۔" عمر نے کہا: "اے ابو الحسنؑ! کتاب اللہ میں اس بات کا ذکر کس مقام پر ہے؟"

امام علیؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"جب تمہارے پروردگار نے بنی آدمؑ کی پشتوں میں سے اُن کی ذرّیت کو حاضر کیا اور اُن کو خود اپنے نفسوں پر گواہ بنایا اور پوچھا کہ کیا میں تم سب کا رب نہیں ہوں؟ تو اُن سب نے کہا کہ ہاں! ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب ہے۔"

(سورہ اعراف - آیت ۱۷۲)

جب انہوں نے فرمانبرداری سے اپنی عبودیت اور اُس کی ربوبیت کا اقرار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے بیت الحرام کے حج کا عہد لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پانی سے بھی لطیف ایک تختہ پیدا کیا اور قلم کو حکم دیا کہ اس پر میرے اُن بندوں کا نام لکھ دے جو بیت اللہ کا حج ادا کر کے اُس کا حق ادا کریں گے۔ پس قلم نے اُس لطیف تختہ پر بنی آدمؑ میں سے اُن لوگوں کے نام لکھے جو اپنے عہد و پیمان کو مکمل طور پر پورا کریں گے۔ پھر پتھر کو کہا گیا: "اپنا منہ کھولو!" تب اُس نے منہ کھولا اور اُس لطیف تختہ کو نگل لیا۔

باری تعالیٰ نے پتھر کو پھر حکم دیا: "اب اس کی حفاظت کرو اور میرے جو بندے تمہارا حق ادا کریں تو اُن کی گواہی دینا۔" اُس وقت یہ پتھر اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں زمین پر اُتر آیا۔

اس کے ساتھ ہی امامؑ نے فرمایا: "اے عمر! جب تم نے پتھر کو بوسہ دیا تو کیا تم نے یہ نہیں کہا: میں نے اپنی امانت اور عہد ادا کیا ہے۔ تاکہ تو میرے حق میں اُس کی گواہی دے؟"

خلیفہ عمر بولے: "بخدا! میں نے یہی کہا۔"

امامؑ نے فرمایا: "تو پھر اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

(بحار الانوار جلد ۹۹ صفحہ ۲۲۷)

(۲) "یہ بھی اگلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانیوالا پیغمبر ہے۔"

(سورۂ نجم۔ آیت ۵۶)

علی بن معمر سے روایت ہے کہ میں نے اس آیت کے متعلق حضرت امام صادقؑ سے دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا: "بے شک جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے عالمِ ذرّ میں ساری مخلوق کو پیدا کیا تو ان کو آگے پیچھے صفوں میں کھڑا کیا۔ پھر وہ محمدؐ کو ان کے سامنے لایا۔ پس ایک گروہ ان پر ایمان لے آیا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "یہ بھی اگلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا پیغمبر ہے۔" یعنی حضرت محمدؐ نے عالمِ ذرّ میں بھی بندوں کو اللہ کی طرف دعوت دی تھی۔ (بحار الانوار جلد ۵ صفحہ ۲۳۴)

(۳) "تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن۔"

(سورۂ تغابن۔ آیت ۲)

حسین بن نعیم صحاف سے روایت ہے کہ میں نے اس آیت کے بارے

میں امام صادقؑ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: "اللہ کے بندے جب آدمؑ کی پشت میں ذرات کی صورت میں تھے تو باری تعالیٰ نے ان سے عہد و پیمان لیا اور ہماری ولایت کے قبول کرنے کو ان کا ایمان اور اس سے انکار کو ان کا کفر قرار دیا ہے۔"

(بحار الانوار جلد ۵ صفحہ ۲۳۴)

اس حدیث کو احمد بن محمد نے بھی ابن محبوب کے سلسلہ سند سے روایت کیا ہے۔

(۴) معلّی ابن خنیس سے روایت ہے کہ امام صادقؑ نے مجھ سے فرمایا: "اے معلّی! یوم نیروز (نوروز) سے مراد وہ دن ہے' جب اللہ تعالیٰ نے بندوں سے عہد و پیمان لیا تھا کہ وہ اس کی عبادت کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کے رسولوں' حجتوں اور ولیوں کی پیروی کیا کریں۔"

(بحار الانوار جلد ۵ صفحہ ۲۳۴)

(۵) حبیب سجستانی سے روایت ہے کہ میں نے امام باقرؑ کو فرماتے ہوئے سنا: "اللہ تعالیٰ نے جب اپنی ربوبیت اور ہر پیغمبر کی نبوت کے متعلق عہد و پیمان لینے کے لیے اولادِ آدمؑ کو ان کی پشت سے نکالا تو پہلے حضرت محمدؐ کی نبوت کا عہد و پیمان لیا۔ پھر حضرت آدمؑ سے کہا: ذرا نظر تو کرو کہ تم کیا دیکھتے ہو؟ حضرت آدمؑ نے اپنی ذریت کی طرف نظر ڈالی جو اس وقت عالم ذر میں تھی اور اس سے آسمان بھر گیا تھا۔ انہوں نے تعجب سے کہا: یارب! میری اتنی ساری اولاد ہے' تو نے ان کو کیوں پیدا کیا ہے؟ پھر ان سے عہد و پیمان لینے کا کیا مطلب ہے؟"

اللہ جل شانہ' نے فرمایا: "اس لیے کہ یہ لوگ میری عبادت کریں' میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔ میرے رسولوں پر ایمان لائیں اور ان کی اطاعت کریں۔"

(بحار الانوار جلد ۵ صفحہ ۲۳۶ - ۲۳۷)

(۶) ابن مسکان سے روایت ہے کہ میں نے سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۲ کے

متعلق امام صادقؑ سے پوچھا: "کیا یہ اقرار لینے کا واقعہ مشاہدہ کی حالت میں واقع ہوا تھا؟"

امامؑ نے جواب دیا: "ہاں! اس طرح اللہ تعالیٰ کی معرفت نفسوں میں نقش ہوئی تھی۔ تاہم لوگ اس بات کو بھول گئے۔ مگر عنقریب وہ اس واقعہ کو یاد کریں گے۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو کوئی نہ جانتا کہ اس کا پیدا کرنے والا اور اس کو روزی دینے والا کون ہے۔ پس بنی آدمؑ میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے عالمِ ذر میں صرف زبان سے اقرار کیا اور صدق دل سے ایمان نہیں لائے۔

(بحارالانوار جلد ۵ صفحہ ۲۳۷)

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"مگر یہ لوگ جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اس پر بھلا کاہے کو ایمان لانے والے تھے۔" (سورۃ اعراف - آیت ۱۰۱)

(۷) ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ امام علیؑ نے سورۃ اعراف کی آیت ۱۷۲ کی تفسیر میں فرمایا:

"اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اور اُن کی پشت پر مسح کیا تو اس میں سے ذرات کی صورت میں ان کی بے شمار اولاد نکلی۔ پھر باری تعالیٰ نے اُن کی اولاد کو عقل عطا فرمائی اور اُن سے اقرار لیا کہ اللہ تعالیٰ اُن کا رب اور وہ سب اُس کے بندے ہیں۔ اس طرح اُن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر کے اپنے نفسوں پر اپنی عبودیت کی گواہی دی۔ اس سلسلے میں اور بھی روایات ہیں جو حدِّ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ (بحارالانوار: کتاب الامامت - باب طینت و میثاق - باب خلق ائمہ و باب اخذ میثاقہم - کتاب النبوت - باب احوالِ آدمؑ - باب فضل الحجر)۔

عالمِ ذر میں اس طرح کا اقرار لینا کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس حالت میں شعور اور خطاب کی قابلیت عطا کرنے پر اللہ تعالیٰ یقیناً قادر ہے بلکہ قرآن پاک کی بعض آیات سے یہ بھی ثابت ہے کہ تمام چیزوں میں یہاں تک کہ جمادات میں بھی شعور ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"اور سارے جہان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اُس کی حمد و ثنا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ مگر تم لوگ اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے۔"

(سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۴۴)

پس جس طرح خود ہمارے حال میں سنّتِ الٰہیہ کا نفاذ مشخص و معلوم ہے، اسی طرح اگرچہ ہم لوگ ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ پاتے۔ مگر وہ بھی سنّتِ الٰہیہ کے مطابق جاری ہے۔

عالِمِ اصلاب

ہر انسان کے لیے اصلاب پدر کے عالم میں ہونے کا دور بھی پایا جاتا ہے اور جب یہ دور ختم ہو جاتا ہے تو وہ تیسرے عالم کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

پس انسان کو چاہیے کہ دیکھے وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ وہ پیدا کیا گیا اُچھلنے والے پانی سے جو ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ (سورۂ طارق۔ آیت ۵ تا ۷)

یہ پانی[1] درحقیقت دو قسم کے پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا وہ جو مرد کی ریڑھ کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے اور دوسرا وہ جو عورت کے سینے کی اُوپر والی

---

[1] اچھلنے والے پانی سے مراد منی ہے۔ صلب سے مراد حرام مغز ہے اور ترائب سے مراد عورت کے سینے کی اوپر والی ہڈیاں ہیں۔ یہ آیت کریمہ اعجاز قرآنی کی ایک اہم دلیل ہے۔

ہڈیوں میں سے نکلتا ہے اور غالباً ان دونوں کو ایک پانی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ آپس میں مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور یہی وہ مخلوط نطفہ ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"ہم نے انسان کو نطفۂ مخلوط سے پیدا کیا ہے۔"

(سورۂ دھر۔ آیت ۲)

چونکہ انسان کی خلقت جس نطفے سے ہوتی ہے وہ مرد اور عورت دونوں کی منی سے مخلوط ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ نے اس کو "مخلوط" کی صفت سے تعبیر فرمایا اور یہ حقیقت اس صدی سے پہلے کے لوگوں کو معلوم نہیں تھی[۱] کہ بچے کی پیدائش مرد و عورت دونوں کی منی سے ہوتی ہے بلکہ لوگ یہی سمجھتے تھے کہ بچہ صرف اپنے باپ کی منی سے پیدا ہوتا ہے یا یہ کہ بچہ مرد کی منی سے اور بچی عورت کی منی سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر قرآن مجید نے ثابت کر دیا کہ مولود خواہ نرینہ ہو یا مادینہ، دونوں ہی کی منی کے اختلاط سے پیدا ہوتا ہے۔

آج جدید سائنسی علوم میں یہ معلوم کر لیا گیا ہے کہ مرد کی منی اس کی ریڑھ کی ہڈیوں میں بنتی ہے اور عورت کی منی اسکے سینے کی اوپر والی ہڈیوں میں بنتی ہے۔ پس جب یہ دونوں پانی عورت کے رحم میں پہنچ کر ایک ہو جاتے ہیں تو بچے کی خلقت شروع ہوتی ہے اور اچھلنے والا پانی ایک عاقل اور ناطق انسان کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے کہ "ریڑھ کے گودے کو اس لیے حرام قرار دیا گیا ہے کہ ہر عورت و مرد میں اچھلنے والا پانی یہیں سے گزرتا

---

[۱] بیسویں صدی کے آخر میں علمی طور پر معلوم کیا گیا کہ مرد کی ریڑھ والی ہڈی میں اس کی منی بنتی ہے اور عورت کے سینے کی اوپری ہڈیوں میں منی بنتی ہے۔

ہے۔ یہ گویا پیٹھ کی عمودی ہڈی میں ہوتا ہے۔" پس اُچھلنے والا پانی اُوپر سے نیچے کو آتا ہے اور حرام مغز سے ہوتا ہوا خصیتین[1] میں داخل ہوتا ہے۔ لہٰذا حرام مغز اس کی پہلی منزل ہوتا ہے اور اس میں موجود پانی مرد کے نطفے کا اوّلین مادہ بنتا ہے جبکہ عورت کی منی کے لیے اس کے سینے کی اوپر والی ہڈیاں پہلا مقام ہوتی ہیں اور وہاں سے وہ رحم میں داخل ہوتی ہے اور آیت کریمہ انہی منزلوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

پس دوسرا مرحلہ وجود انسانی کا صلب پدر ہے جہاں اس کی منی کی تخلیق ہوتی ہے اور اس امر کو انسان بہت دنوں سے جانتا ہے کہ نطفے میں والدین کی بہت سی خصوصیات و صفات کو بچّے کی طرف منتقل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ نطفہ کسی درخت کے بیج کی مانند ہوتا ہے کہ جب اس بیج کو کاشت کیا جاتا ہے تو وہ اپنی نشوونما کے ساتھ ساتھ بتدریج اپنی خصوصی صفات اختیار کرتا جاتا ہے۔ یہی حال حیوانات کا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ پرندے اپنے ماں باپ کی شکل وصورت اور پروں کا رنگ بھی پالیتے ہیں۔ انسان کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ حبشی اپنی جلد کی سیاہی، گچھے دار بالوں، چپٹی ناک اور آنکھوں کے رنگ وغیرہ میں اپنے باپ دادا سے مشابہت رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر بچّہ اپنے والدین کے اعضا اور

---

[1] امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ خصیوں کا کھانا اس لیے حرام کیا گیا کہ یہ جماع کا مقام اور منی کی گزرگاہ ہوتا ہے۔ اہل سائنس نے اب اس حقیقت کو معلوم کر لیا ہے کہ خصیے منی کی گزرگاہ ہوتے ہیں اور ریڑھ سے آکر منی یہیں اترتی ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ نے اپنے آباءِ طاہرینؑ کے سلسلے سے امیرالمومنین علیؑ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ "رسول اللہؐ تو گردوں کو بھی ان کی حرمت کے بغیر ان کے پیشاب سے قریب ہونے کی وجہ سے نہیں کھاتے تھے۔"

رنگ کو طبعی طور پر حاصل کر لیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ خلیات جن سے جنین کی تخلیق ہوتی ہے اور ان میں آباء و اجداد کی صفتیں موجود ہوتی ہیں حالانکہ وہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ بغیر خوردبین کے اُن کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ پھر بھی وہ اُن تمام طبیعیاتی اور کیمیائی خصوصیتوں کو اپنے میں محفوظ رکھتے ہیں، جن سے انسان کی ماہیت کا تعین ہوتا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ خلیات میں عوامل وراثت کیسے چھپے ہوتے ہیں؟ وہ پروٹوپلازما کا کونسا جزو ہوتے ہیں؟ یا کہاں ہوتے ہیں کہ جہاں سے اُن کو یہ ساری مشابہت حاصل ہوتی ہے۔

وراثتی صفتیں

جدید علوم کے ماہرین عظیم کوششوں اور گہری تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خلیات میں بیضوی شکل کی کنارے دار گٹھلیاں ہوتی ہیں جن کے اندرونی حصے میں نہایت چھوٹے چھوٹے اجسام ہوتے ہیں جو خلیہ کو توڑنے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان اجسام کا نام انھوں نے "کروموسوم" رکھا ہے اور ان "کروموسومات" میں نہایت چھوٹے چھوٹے جسم ہوتے ہیں جن کو وہ "جینیات" کا نام دیتے ہیں اور انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ماں باپ کی وراثتی صفتیں ان ہی اجسام کے ذریعے بچے میں منتقل ہوتی ہیں۔

شرع مقدس اسلام نے اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور وہ یوں کہ سورۂ دہر کی دوسری آیت میں اللہ نے فرمایا ہے کہ: "ہم نے انسان کو نطفۂ امشاج سے پیدا کیا۔" تو "امشاج" کے معانی میں سے ایک معنی "طبائع مختلفہ" بھی ہیں بعض تفسیروں میں لفظ "امشاج" کی تشریح

میں کہا گیا ہے کہ "اس سے مراد مختلف طبیعتیں ہیں۔ جیسے گرمی، سردی، خشکی، اور تری وغیرہ جو نطفے میں شامل ہوتی ہیں اور پھر ان ہی حیوانی طبیعتوں میں اللہ نے اعتدال پیدا کر کے اس میں حیات کی بنیاد رکھ دی اور پھر اسکو سماعت و بصارت جیسی نعمتیں عطا کر دیں۔ پس برکت والا ہے وہ اللہ جو رب العالمین ہے۔"

حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "اس بارے میں نگاہ رکھو کہ تم اپنی اولاد کو کس ظرف میں رکھ رہے ہو۔ کیونکہ عروق نسوانی "وساس" ہوتی ہیں۔" لفظ "وساس" کی تشریح کرتے ہوئے مشہور لغت المنجد کے مؤلف نے لکھا ہے کہ اس سے مراد "اخلاقِ والدین کو بچوں کی طرف منتقل کرنے والی" ہے اور وراثت طبعی میں اس کا زبردست اثر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کو نصیحت کرتے تھے کہ وہ زوجیت میں احتیاط کریں۔ یعنی بیج ڈالنے سے پہلے یہ دیکھ لیا کریں کہ زمین بھی صالح ہے یا نہیں تاکہ اولاد میں ماں کی طرف سے بری صفات پیدا نہ ہوں۔

امیرالمومنین امام علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ "حسنِ خلق شرافتِ نسب کی دلیل ہے۔" یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ کسی فرد کی عمدہ خصلتوں سے اس کی خاندانی پاکیزگی کو جاننا ممکن ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی زیارتِ وارثہ میں الفاظ آئے ہیں: "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ بلند مرتبہ اصلاب اور پاکیزہ ارحام میں نور تھے۔ اس جملے میں بھی اس امر کی دلالت موجود ہے کہ انعقاد نطفہ کے لیے مرد کا صلب اور عورت کے سینے کی ہڈیاں ظرف ہوتی ہیں اور اس کا بھی ثبوت ہے کہ عمدہ صفات ماں باپ سے وراثت میں ملتی ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت محمد حنفیہ رضی اللہ عنہ جنگ جمل میں امیر المومنین علیہ السلام کے علمبردار تھے۔ پس جناب امیرؑ نے ان کو حکم دیا کہ وہ دشمن کی فوج پر بڑھ کر حملہ کریں۔ وہ کچھ دُور بڑھے لیکن نیزوں اور تیروں کی بوچھاڑ نے ان کو مزید بڑھنے سے روک دیا اور وہ کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ یہ دیکھنا تھا کہ امیر المومنینؑ تیزی سے ان کے پاس آئے اور فرمایا: "ان ہی نیزوں اور تیروں میں بڑھ کر حملہ کرو۔"

وہ کچھ اور آگے بڑھے مگر پھر ٹھہر گئے۔ امامؑ نے اپنے بیٹے کا یہ حال دیکھا تو بڑھ کے ان کے پاس گئے۔ اپنی تلوار کا دستہ ان کے سینے پر مارا اور فرمایا: "یہ تم میں تمہاری ماں کا اثر آگیا ہے" اور خود دوں حملہ آور ہوئے کہ صفوں کو چیر کر رکھ دیا۔

جناب امیرؑ نے اپنے اس جملے سے ثابت کر دیا کہ وہ ضعف و تردّد جو حضرت محمد حنفیہؓ سے ظاہر ہوا وہ انہیں ان کے باپ سے وراثت میں نہیں ملا تھا۔ کیونکہ حیدرِ کرارؑ کے یہاں کم ہمتی کا کوئی شائبہ بھی نہیں مل سکتا۔ لہٰذا جناب محمد حنفیہؓ کا یہ توقف ان کی ماں کے اثر سے تھا۔

طفرہ

اس کے باوجود کبھی کبھی اس اصول کے خلاف بھی نظر آتا ہے کہ بعض بیٹوں میں ان کے باپ کی صفتیں کچھ بھی منتقل نہیں ہوتیں اور ہم بہت سی مثالوں میں دیکھتے ہیں کہ قانونِ وراثت کارفرما نہیں ہوتا اور یہ بات انسان، حیوان اور نباتات سب ہی میں دیکھی جاسکتی ہے کہ صفتیں جامد ہو کر رہ جاتی ہیں اور سابق سے لاحق تک نہیں پہنچتیں۔ اسے "طفرہ" (اتفاقی چھلانگ) کہا جاتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لڑکے سفیدی مائل آنکھوں، سرخ بالوں اور

سفید رنگ کے پیدا ہوتے ہیں، جبکہ ان کے ماں باپ ایسے نہیں ہوتے۔ اس اتفاقی چھلانگ کے حسب ذیل دو بڑے سبب ہو سکتے ہیں:

اسباب طفرہ

اول یہ کہ بطور طفرہ پیدا ہونے والی نسل میں جو صفتیں ظاہر ہوئیں وہ سابقہ نسلوں میں، اگرچہ دُور کی نسلیں ہوں، موجود تھیں مگر ظاہر نہیں ہو سکی تھیں بلکہ پوشیدہ رہ گئی تھیں۔ پھر کچھ ایسے مناسب حالات پیدا ہوئے کہ ان نسلوں میں وہ پوشیدہ صفتیں ظاہر ہو گئیں۔

امام علی رضا علیہ السلام نے اپنے آباء طاہرینؑ کی سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا: "کیا پیدا ہوا ہے تمہارے یہاں؟"

اس نے کہا: "یا رسول اللہؐ! پید کیا ہونا ہے! یا لڑکا یا لڑکی!"

پیغمبر نے پوچھا: "وہ کس سے مشابہ ہوگا؟"

اُس مرد نے کہا: "اپنی ماں کے مشابہ ہوگا یا اپنے باپ کے!"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "یہ نہ کہو، کیونکہ نطفہ جب رحمِ مادر میں قرار پاتا ہے تو اللہ حضرت آدمؑ سے لے کر اس بچے تک جتنی نسلیں گزر چکی ہیں، سب کو پیش کرتا ہے۔ کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی؟ جس میں ارشاد باری ہے:

"جس صورت میں بھی اللہ چاہتا ہے تجھے بنا دیتا ہے۔"

(سورۃ انفطار۔ آیت ۸)

یعنی خدا تمہارے اور حضرت آدمؑ کے درمیان کی تمام صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بنا دیتا ہے۔" [۱]

---

[۱] بحار الانوار جلد ۱، صفحہ ۹۴

دوم یہ کہ طبیعت میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو "جنینیات" میں ابتدائی تغیر کا باعث بنتے ہیں جن کے نتیجے میں نئی صفتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس صورت میں تین قسم کے حالات ممکن ہیں:

۱۔ وراثتی صفتوں کا مسلسل ظاہر ہوتے رہنا۔

۲۔ بعض وراثتی صفات کا کسی نسل میں مخفی ہو جانا اور ایک مدت تک مخفی حالت میں پڑے رہنا۔

۳۔ نئی صفات کا ظاہر ہو کر آگے کے لیے مسلسل ہو جانا۔

تخلیقِ جنین میں خوراک کا اثر

ہم نے طبیعت میں بعض ایسے اسباب پیدا ہونے کا جو ذکر کیا ہے، جن سے وراثتی صفتوں میں تغیر واقع ہوتا ہے، اس کی تائید ان حدیثوں سے ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ بعض چیزوں میں بعض صفات پیدا کرنے کی خاصیت ہوتی ہے۔ یعنی ان کے ذریعے قانون "طفرہ" تک پہنچنا ممکن ہو جاتا ہے۔ جیسے بعض غذاؤں کے بارے میں ہے کہ ان کا اثر نطفے تک پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث مبارکہ میں نسل کو خوبصورت بنانے کے لیے بعض چیزوں جیسے ناشپاتی، سیب اور خرما وغیرہ کھانے کی تاکید کی گئی ہے۔[1]

---

[1] کتاب الوسائل کے باب "اطعمہ واشربہ" میں یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زبیر سے فرمایا: "ناشپاتی کھایا کرو۔ کیونکہ اس میں تین خصوصیات ہوتی ہیں: وہ دل جمعی عطا کرتی ہے۔ بخیل کو سخی بنا دیتی ہے اور بزدل کو شجاعت دلاتی ہے۔

کتاب مذکور کی بعض حدیثوں میں ہے کہ جو شخص نہار منہ ناشپاتی کھائے

شرع مقدس میں بعض اوقات اور بعض حالات میں جماع کرنے سے منع بھی کیا گیا ہے۔ جدید علوم کے ماہرین شاید اس نہی میں پوشیدہ رموز کو بھی

اس کا مادۂ منویہ بہتر ہو جاتا ہے اور بچہ خوبصورت پیدا ہوتا ہے اور بعض میں کہا گیا ہے کہ ناشپاتی رنگ کو صاف کرتی ہے اور بچے کو خوبصورت بناتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے امیرالمومنینؑ سے فرمایا: "اے علیؑ! جو تین دن تک مسلسل نہار منہ ناشپاتی کھائے تو اُس کا ذہن صاف ہو جاتا ہے، علم و حلم سے پُر ہوتا ہے اور ابلیس و فوج ابلیس سے محفوظ رہتا ہے۔"

کتاب الوسائل ہی کے باب اطعمہ واشربہ میں پیغمبر اکرمؐ کی امام علیؑ کے لیے یہ نصیحت بھی منقول ہے کہ "اے علیؑ! نو چیزوں سے نسیان کا مرض پیدا ہوتا ہے:

۱۔ کھٹا سیب
۲۔ کُزبُرہ (کشنیز)
۳۔ پنیر
۴۔ چوہے کا جھوٹا کھانا
۵۔ قبروں پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنا
۶۔ دو عورتوں کے درمیان چلنا
۷۔ جوئیں پڑ جانا
۸۔ مقام نُقرہ (سر کے اوپر کے ایک مقام) میں فصد کھلوانا
۹۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا

اور انار کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ "جو شخص انار کھائے اس کا قلب روشن ہو جاتا ہے اور جس کا قلب روشن ہو جائے اُس سے شیطان دُور رہتا ہے۔"

اسی طرح دریافت کرلینگے جس طرح انہوں نے بعض غذاؤں کے اثرات کو مادہ منویہ اور اس سے پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں معلوم کرلیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "اگر میں عراق میں ہوتا تو سورانی انار کھاتا اور فرات میں غسل کرتا"۔

آپ ہی نے فرمایا ہے کہ "انار کو گودے سمیت کھاؤ کیونکہ وہ معدے کی اصلاح کرتا ہے اور ذہانت میں اضافہ کرتا ہے"۔

خرمے کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "ایک مرتبہ رسول اللہؐ کے پاس خرمے بطور ہدیہ بھیجے گئے۔ آنحضرتؐ نے لانے والوں سے پوچھا: یہ کونسے خرمے ہیں؟" انہوں نے کہا: "برنی قسم کے اے خدا کے رسولؐ!" حضورؐ نے فرمایا: "دیکھو یہ جبرئیلؑ بتا رہے ہیں کہ اس قسم کے خرموں میں ۹ خصوصیتیں ہوتی ہیں:

(۱) شیطان کو ناتواں بناتا ہے
(۲) کمر میں قوت پیدا کرتا ہے
(۳) قوت جماع کو بڑھاتا ہے
(۴) اللہ سے قریب کرتا ہے
(۵) قوت سماعت اور بصارت کے لیے نفع بخش ہے
(۶) شیطان سے دُور رکھتا ہے
(۷) کھانا ہضم کرتا ہے
(۸) امراض کو دفع کرتا ہے
(۹) منہ میں خوشبو پیدا کرتا ہے

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ ہر خرمے کے ساتھ ایک نیکی ہے۔

پنیر کے بارے میں یہ مروی ہے کہ وہ دن کے وقت نقصان دہ ہوتا ہے اور رات کو نفع بخش ہوتا ہے اور پیٹھ کے پانی میں اضافہ کرتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ پنیر اور اخروٹ اگر اکٹھے ہو جائیں تو ہر ایک میں شفا ہے اور اگر

الگ ہوں تو ہر ایک میں مرض ہے۔

یہ تو احادیث کا تذکرہ تھا اور علمائے طبیعیات نے کہا ہے کہ جب کوئی شخص جماع کا ارادہ رکھتا ہو تو ضروری ہے کہ اس کی غذا میں غذائیت کے لیے لازم تمام اجزا خصوصاً وٹامن اے ضرور شامل ہو۔ انھوں نے بتایا ہے کہ جماع کے وقت اگر باپ کا نطفہ زہریلے اجزاء سے متاثر ہوگا تو بچہ ناقص ہوگا یا بدشکل ہوگا۔ یہ زہریلا پن فاسد قسم کی چیزوں کے کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح نشہ اور مشروبات کا بھی پیٹ کے بچے پر بُرا اثر ہوتا ہے کیونکہ وہ صلب پدر میں نطفے کو مسموم بنا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ماہرین اس سے پرہیز کا مشورہ دیتے ہیں اور شرع مقدس اسلام نے ماہرین کے اس نتیجے تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی اس کے نقصان سے لوگوں کو آگاہ کر دیا تھا۔

چونکہ گفتگو یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ نشہ آور چیزوں سے نطفہ مسموم ہو جاتا ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نشہ آور چیزوں کے عقلی، خلقی، اجتماعی اور صحت سے متعلق نقصانات کو بھی بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ بعض ماہرین نے تولید و تناسل سے متعلق اعضاء پر الکحل کے بُرے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

چھڑے سمیت بھیڑ کا کباب، سیسے کے ظرف میں تیار کی ہوئی شراب اور الکحل نطفہ کو مسموم بنانے کے اسباب میں سے ہے۔ ماہرین نے کہا ہے کہ الکحل جنسی احساس کو کمزور کر دیتا ہے۔ انسان کو بے شرم بنا دیتا ہے اور انجام بینی سے محروم کر کے بغاوت و فحاشی پر اُبھارتا ہے۔ نیز مختلف امراض بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کے

۱۔ چاند گرہن کی رات
۲۔ سورج گرہن کے دن

اجتماعی نقصانات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان کی نسل میں کمزوری پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی تیسری یا چوتھی نسل میں بانجھ پن کا باعث ہوتا ہے۔ نیز وہ پہلی یا دوسری نسل میں سل کے مرض کا باعث بھی ہو سکتا ہے جو کہ ایک مہلک مرض ہے علاوہ بریں شراب نوشی سے معاشرے پر جو نہایت بُرا اثر پڑتا ہے اس سے بھی ہمیں غافل نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ نشہ کرنیوالوں کے بچے بھی غیر صالح ماحول میں بُری طرح نشو ونما پاتے ہیں اور ان کے باپ ان کے لیے بدترین نمونہ پیش کرتے ہیں لہٰذا وہ بھی اس غلط راہ پر چل پڑتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو جس حالت میں بچپن گزارتا ہے اسی حالت پر وہ جوان بھی ہو جاتا ہے۔

بہر طور نشہ کرنے والے اپنی اولاد کے لیے کوئی اچھا نمونہ نہیں پیش کرتے ماہرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نشہ کی عادت رکھنے والے دوسروں کے مقابلے میں عمر بھی کمتر پاتے ہیں۔ مدافعت امراض کی قوت بھی ان میں کم ہوتی ہے اور کام کاج میں بھی ان کی کارکردگی بہتر نہیں ہوتی۔ (کتاب الخمر از شیخ محمد رضا سماوی)

حفاظت حیات کے بارے میں متمدن ملکوں میں کام کرنیوالے ادارے واقعی اس امر پر متفق ہیں کہ شرابیوں کی عمریں دوسروں کے مقابلے میں کمتر ہوتی ہیں اور شرابی مریضوں میں موت کا تناسب غیر شرابی مریضوں کے مقابلے میں دو چند کے قریب ہوتا ہے۔

جہاں تک صحت پر شراب کے بُرے اثرات کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں بھی سن لیجیے کہ انسانی جسم نہایت لطیف واقع ہوا ہے اور خلاق عالم نے اسے

۳ــــ زوال آفتاب کے وقت (جمعرات کے علاوہ کسی دن میں)
۴ــــ غروب آفتاب کے وقت، جب تک شفق نہ ڈھل جائے۔

نہایت لطیف صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ یہ تمام لطیف صلاحیتیں شراب پینے اور دوسری نشہ آور چیزوں کے استعمال سے ضائع ہو جاتی ہیں۔ طب جدید نے اس کے مہلک آثار کے بارے میں تحقیق کی ہے اور ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جسم انسانی پر اس کے نہایت بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخلص معالج اس لعنت سے پرہیز کرنے ہی کا مشورہ دیتے ہیں اور اُس کی بُرائیاں بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ مؤلف جلیل شیخ محمد خلیلی اپنی کتاب "المغریات العشر" (یعنی دس تباہ کن اشیاء) میں دائرۃ المعارف سے علامہ بستانی کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "شراب انسان کی اہم باریک نسوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور اُس کے مسلسل استعمال سے جسم کا ہر عضو بیمار ہو جاتا ہے، خصوصاً اعضائے رئیسہ پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے نقصانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ نظامِ ہضم کو بھی خراب کرتی ہے اور خرابی ہضم سے سارے جسم پر جو بُرا اثر پڑتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں کیونکہ غذا ہی حیات و تندرستی کو باقی رکھنے کا واحد سہارا ہے۔

علاوہ بریں شراب کا اثر دورانِ خون پر بھی پڑتا ہے۔ کیونکہ الکحل کے سبب سے باریک اور موٹی تمام نسیں پھیل جاتی ہیں۔ نیز جگر سمیت تمام اعضاء میں اس کا میل جمع ہوتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں رگیں سخت ہو جاتی ہیں اور اپنے معمول کے عمل سے قاصر ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح الکحل سے گردے بھی متاثر ہوتے ہیں اور کبھی کبھی اُن میں اتنی سوزش پیدا ہو جاتی ہے کہ خونی پیشاب آنے لگتا ہے۔ کیونکہ گردے پیشاب کو صاف کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں اور خون پیشاب میں مل

۵ ـــ محاق کی راتوں میں (قمری مہینے کی وہ دو یا تین راتیں جب چاند بالکل غائب ہوتا ہے)۔

جاتا ہے جس سے دورانِ خون میں خلل پڑتا ہے اور اس طرح جسم کی قوت مدافعت امراض کے مقابلے میں ختم ہو جاتی ہے اور جراثیم کو حملہ کرنے کا بھرپور موقع ملتا ہے، جس کے خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ شراب کے اثرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شراب کی عادت سے سرطان پیدا ہوتا ہے اور کچھ دوسرے خطرناک امراض بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ امراض میں سے ہر ایک ایسا ہے کہ عقلمند کو اس سے بچنے کے لیے اس کو پیدا کرنے والے اسباب سے بچتے رہنا چاہیے، چاہے دین کی طرف سے کوئی ممانعت نہ بھی ہو۔ پس ایسی صورت میں جبکہ ہمارے دین نے اس چیز سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے، یہاں تک کہ اس کی خرید و فروخت اور تیاری کو بھی حرام قرار دیا ہے اور اسے نجس العین کہا ہے تو ہم کیسے نہ پرہیز کریں۔

پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو شراب، جوا، انصاب اور ازلام تو بس اعمال شیطان کی گندی چیزیں ہیں لہٰذا تم لوگ اس سے پرہیز کرو تاکہ فلاح پاسکو۔ یقیناً شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ وہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے عداوت اور کینہ ڈال دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے تو کیا تم لوگ ان چیزوں سے باز آؤ گے؟"

(سورۂ مائدہ۔ آیت ۹۰-۹۱)

جناب رسالتمآبؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ "اللہ نے لعنت کی ہے شراب پر، اس کے پینے

۶۔۔۔ طلوعِ فجر سے طلوع آفتاب تک

۷۔۔۔ رمضان شریف کے علاوہ ہر قمری مہینے کی چاندرات کو۔

والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، نچوڑنے والے، کشید کرنے والے، اٹھانے والے، منگوانے والے اور اس کی کمائی کھانے والے تمام لوگوں پر!"

نیز آنحضرتؐ کے فرمودات میں ہے:

- "پرہیز کرو شراب سے کہ وہ برائی کی کنجی ہے۔"
- "پرہیز کرو شراب سے کہ وہ تمام برائیوں کی اصل ہے۔"
- "جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ شراب نہ پیئے اور اس دسترخوان پر نہ بیٹھے جہاں شراب پی جاتی ہو۔"
- "جو شراب پینے کی عادت میں مرجائے وہ اللہ کی بارگاہ میں بت پرست کی حیثیت سے جائے گا۔"
- "زنا کرنے والا زنا کرنے کے وقت مومن نہیں رہتا۔ چور چوری کرنے کے وقت مومن نہیں رہتا۔ شراب پینے والا شراب پینے کے وقت مومن نہیں رہتا۔"

مذکورہ بالا احادیث کے علاوہ بھی بہت سی حدیثیں شراب کی مذمت میں آئی ہیں اور یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ کسی استدلال کی ضرورت نہیں۔

شراب و نشہ کے خلاف جہاں بڑے بڑے طبیبوں نے لکھا ہے وہیں معاشرتی علوم پر لکھنے والوں اور ماہرینِ قانون نے بھی لکھا ہے اور اس موضوع پر مزید لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کی روک تھام کرنا صرف مسلمانوں کی مہم نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کی مہم ہے اور زمین کے طول و عرض میں مختلف مذاہب و نظریات کے لوگ اجتماعی طور پر انسانیت کو اس لعنت سے نجات دلانے

۸۔۔۔۔ ہر مہینے کی پندرھویں رات کو

نیز انہوں نے بعض حالات میں بھی جماع کو مکروہ قرار دیا ہے۔ مثلاً:

- حالت سفر میں جبکہ غسل کے لیے پانی نہ ہو۔
- سیاہ، زرد یا سُرخ آندھی چلنے کے وقت۔
- زلزلے کے وقت۔

اسی طرح بالکل برہنہ ہو کر جماع کرنا اور احتلام کے بعد غسل یا وضو سے پہلے جماع کرنا بھی مکروہ ہے۔ البتہ مکرر جماع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے تاکہ صرف آخری کے بعد غسل کرے۔ کیونکہ حدیث میں احتلام اور جماع میں یہ فرق بتایا گیا ہے کہ احتلام شیطان کیطرف سے ہوتا ہے اور بار بار جماع کی صورت میں شرمگاہ کو دھو لینا اور جماع سے پہلے وضو کر لینا مستحب ہے۔

اسی طرح ایسی حالت میں بھی جماع کرنا مکروہ ہے جبکہ کسی صاحبِ شعور شخص کی نظر پڑ جانے کا خطرہ ہو یا کوئی صاحبِ شعور، مرد و عورت کی باتوں یا تنفس کو سنتا ہو ۱؎ اور مرد کے لیے مکروہ ہے کہ وہ جماع کے وقت عورت کی شرمگاہ پر نظر کرے۔

کے لیے کوشاں ہیں۔ ان میں ڈاکٹر بھی ہیں، سائنس دان بھی اور قانون و معاشرت کے ماہرین بھی ہیں۔

۱؎ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اس کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی زوجہ سے اس حالت میں ہمبستری کرتا ہے کہ اسی گھر میں کوئی بچہ جاگ رہا ہو۔ اس طرح کہ وہ ان دونوں کو دیکھ رہا ہو اور ان کے کلام و تنفس کو سُن رہا ہو تو ایسا شخص

بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ وقت ظہر کے بعد جماع مکروہ ہے کیونکہ اس سے بچے میں بھینگا پن پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ البتہ جمعرات کے دن کا استثنا ہے اور یہ بھی مکروہ ہے کہ کسی اور عورت کے دیکھنے یا تصور سے شہوت پیدا ہو تو خود اپنی زوجہ سے اسی شہوت میں جماع کرے کیونکہ اس سے بچہ بستر پر پیشاب کرنیوالا ہو جاتا ہے اور عید قربان کی شب کو بھی جماع مکروہ ہے کیونکہ اس سے بچے میں ایک انگلی زیادہ یا کم ہو جاتی ہے۔

ثمر دار درخت کے نیچے جماع کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس سے بچہ جلاد، قتال یا عریف[1] ہو جاتا ہے۔ شعاعِ آفتاب میں بغیر پردہ ڈالے جماع کرنا بھی مکروہ ہے کہ اس سے زندگی بھر کا فقر و فاقہ نصیب ہوتا ہے۔ اسی طرح اذان و اقامت کے درمیان جماع میں کراہیت ہے کہ اس سے بچہ خوں ریزی پر مائل ہوتا ہے۔ بغیر وضو

کبھی فلاح نہیں پاسکتا۔ اگر وہ لڑکا ہوگا تو زانی بنے گا اور لڑکی ہو تو زانیہ ہو جائے گی"۔ امام زین العابدین علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ جب آنجناب اپنی زوجہ سے مقاربت کا ارادہ کرتے تو کمرے کے دروازوں کو پہلے قفل لگاتے پھر ان پر پردے ڈالتے اور پھر کسی خادم کو اس کمرے کے قریب آنے کی اجازت نہ دیتے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ بچہ صاحب تمیز نہ ہو تب بھی احتیاط لازم ہے کیونکہ اس سے زنا کی طرف رغبت کا خطرہ ہے (علل الشرائع جناب صدوق علیہ الرحمہ)۔

[1] عریف اس شخص کو کہتے ہیں جو حکومت کی طرف سے کسی قبیلے یا محلے کا مقرر کردہ نمائندہ ہوتا تھا اور ظالم حکومتوں کے لیے ان کے جبر و استبداد میں مددگار ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے حدیث میں ہے کہ "جو عریف بنتا ہے وہ قیامت کے دن یوں آئے گا کہ اسکے دونوں ہاتھ اس کی گردن سے بندھے ہوں گے"۔ (مجمع البحرین)

جماع بھی مکروہ ہے کہ بچہ بے بصیرت اور بخیل ہوتا ہے ــــــ کھلی چھت پر جماع کو اس لیے مکروہ قرار دیا گیا ہے کہ بچہ منافق و ریاکار ہو سکتا ہے۔ نیز خضاب کر کے یا شکم سیری[1] کی حالت میں بھی جماع کرنا مکروہ ہے اور جماع کے وقت ذکرِ خدا کے سوا کلام کرنا بھی مکروہ ہے۔ مزید معلومات کے لیے فقہ و حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے[2]۔

جماع کے لیے مستحب اوقات

جماع کے وقت بسم اللہ کہنا اور باوضو ہونا مستحب ہے۔ شب دوشنبہ میں جماع مستحب ہوتا ہے۔ اس سے بچہ حافظِ کتاب اللہ اور راضی برضا ہوتا ہے۔ شب سہ شنبہ میں بھی جماع مستحب ہے کہ اس سے پیدا ہونے والا بچہ شہادتین کے بعد رتبۂ شہادت بھی پا سکتا ہے اور اللہ اس کو عذاب نہیں دیتا۔ نیز وہ بچہ خوشبوئے جسم و دہن رکھنے والا، رحم دل، ہاتھ کا سخی اور غیبت و بہتان سے پاکیزہ ہوگا۔ اسی طرح روز پنج شنبہ زوالِ آفتاب کے قریب جماع کرنا بھی مستحب ہے کہ اس سے پیدا ہونے والا بچہ شرِ شیطان سے محفوظ رہتا ہے اور

---

[1] امام صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: "تین چیزیں جسم کے لیے نہایت خطرناک بلکہ کبھی مہلک بھی ہوتی ہیں۔ شکم سیری کی حالت میں حمام میں جانا، شکم سیری میں جماع اور بوڑھی عورت سے جماع کرنا۔

[2] صاحبِ مسالک نے فرمایا ہے کہ ان اسباب کراہت کے مطابق جہاں حمل کا امکان ہو، وہاں کراہت ہے، جہاں نہ ہو وہاں نہیں۔ مگر صاحبِ جواہر نے فرمایا ہے کہ ان اسباب کے ذکر میں حکمت ہے اور حکم کراہت میں عمومیت ہے۔ پس کراہت ہر صورت ثابت ہے خواہ حمل ممکن ہو یا نہ ہو۔

اللہ اسے دین و دنیا میں سلامتی عطا کرتا ہے۔ پھر روزِ جمعہ عصر کا وقت بھی جماع کے لیے مستحب ہے کہ بچہ مشہور و معروف عالم ہو سکتا ہے اور شب جمعہ وقتِ عشاء کے بعد جماع سے بچے کا ابدال میں سے ہونا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

اس گفتگو کو دوسرے لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ مستحب اوقات کے اختیار کرنے اور مکروہات سے پرہیز کرنے کے ذریعے انسان اپنے بچے کی تخلیق میں حسن و خوبی کی طرف "طفرہ" واقع ہونے کی اُمید کر سکتا ہے۔

آگے چل کر ہم بیان کریں گے کہ وراثتی صفتیں دو قسم کی ہوتی ہیں یعنی بعض تو حتمی ہوتی ہیں مگر بعض میں تبدیلی ممکن ہوتی ہے۔ یعنی یہ ممکن ہوتا ہے کہ اگر وہ بُری ہوں تو بچے کو اُن سے بچایا جا سکے اور اگر اچھی ہوں تو انکی نشو و نما اور اُن کے استحکام کے لیے کوشش کی جا سکتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا ان آخری قسم کی صفات کا بہترین ثبوت ہے۔

بطنِ مادر

انسان صلبِ پدر سے منتقل ہو کر بطنِ مادر کی طرف آتا ہے۔ اس مرحلے میں اسے تین تاریکیاں گھیرے ہوئے ہوتی ہیں۔ اس جھلی کی تاریکی جس میں بچّے کی تخلیق ہوتی ہے۔ رحم یعنی بچّہ دانی کی تاریکی اور پیٹ کی تاریکی —— مطلب یہ ہے کہ وہ تین پردوں میں ہوتا ہے۔

کسی فردِ انسانی کی تخلیق میں جو چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں، ان میں سے کچھ رحمِ مادر میں بھی اسی طرح موجود ہوتی ہیں جیسے ان میں سے کچھ صلبِ پدر میں ہوتی ہیں۔ علمی تحقیقات سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کی سعادت اور شقاوت پر اثر انداز ہونے کے سلسلے میں اس دور کو بڑی اہمیت حاصل ہے جب وہ اپنی ماں کے رحم میں ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو ہم آیات کریمہ، احادیثِ شریفہ اور علماء کے اقوال کی روشنی میں مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔

آیاتِ کریمہ

پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"اور یقیناً ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر ایک محفوظ مقام میں رکھا۔ پھر ہم نے اس نطفے کو جما ہوا خون بنا دیا۔ پھر اس جمے ہوئے خون کو ہم نے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر اس لوتھڑے میں ہم نے ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں پر ہم نے گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اسے ایک اور ہی مخلوق بنا دیا۔ پس برکت والا ہے وہ اللہ جو سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے۔"

(سورۃ مومنون۔ آیات ۱۲ تا ۱۴)

اس آیت کریمہ کے بارے میں علامہ محمد حسین طباطبائیؒ اپنی تفسیر "المیزان" کی ۱۵ ویں جلد میں لکھتے ہیں کہ "نطفہ[۱]" تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں اور کبھی کبھی مطلقاً پانی کے لیے بولا جاتا ہے اور لفظ "قرار" مصدر ہے جس سے بطور مبالغہ قرار کی جگہ مراد لیا گیا ہے اور لفظ "مکین" کے معنی ہیں متمکن یعنی قدرت رکھنے والا کیونکہ بچہ دانی (رحم) نطفے کو ضائع ہونے یا فاسد بگڑنے سے محفوظ رکھتی ہے یا اس لیے کہ خود نطفہ اس میں محفوظ طور پر ٹھہرا رہتا ہے۔ پس معنئ آیت یہ ہوئے کہ ہم نے انسان کو نطفے کی حالت میں ایک محفوظ مقام

---

[۱] اسی تفسیر کی جلد ۲۰ سورۃ الدھر میں فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ لفظ "نطفہ" کا استعمال عام طور پر کسی حیوان کے اس پانی کے لیے مشہور ہو گیا ہے جس سے اسی کے مثل دوسرا حیوان پیدا ہوتا ہے۔ یعنی "منی"!

یعنی رحم میں ٹھہرادیا۔ جیسے کہ اس کو ابتدا میں جوہرِ طین سے پیدا کیا تھا۔ یعنی ایک حالت سے اس کو دوسری حالت میں بدل دیا۔

ظاہر ہے کہ سنتِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

"پس ہرگز نہ پاؤ گے تم اللہ کے طریقے میں کوئی تبدیلی اور ہرگز نہ پاؤ گے تم اللہ کے طریقے میں کوئی تغیر۔"

(سورۃ فاطر۔ آیت ۴۳)

لہٰذا انسان لحظہ بہ لحظہ قوانین قدرت کے تحت ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف رحمِ مادر میں پیدائش تک بدلتا رہتا ہے اور قدم بہ قدم تکامل کی راہ حکم الٰہی سے طے کرتا رہتا ہے۔ پھر وہ گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ پھر وہ قانون الٰہی کے تحت گوشت سے ملبوس ہڈیوں کی شکل میں ایک ڈھانچہ بن جاتا ہے اور پھر خالقِ عالم اس میں روح ڈال دیتا ہے۔ پس یہ تغیرات جو رحمِ مادر میں بچے پر مسلسل وارد ہوتے رہتے ہیں وہی اس میں سعادت یا شقاوت کی صلاحیتیں بھی پیدا کرتے ہیں۔

خلیہ سے حیاتِ جنین کی ابتدا

پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"اللہ وہی ہے جو رحم میں تمہاری صورت جیسے چاہتا ہے بناتا ہے۔ نہیں ہے کوئی لائقِ عبادت سوائے اس کے جو عزیز اور حکیم ہے۔"

(سورۃ آلِ عمران۔ آیت ۶)

بعض محققین نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جس طرح اس مفہوم کی عظمت آج کے دور میں ظاہر ہوتی ہے ویسے پہلے نہ ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اب علم الحیات اور جنینی (یعنی پیدائش سے پہلے رحمِ مادر میں تخلیق پانے والے

نتیجے کے بارے میں بہت سے حقائق معلوم کرلیے گئے ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ جنین ابتدائی حالت میں تو بس ایک خلیہ ہوتا ہے۔ جس میں نہ انسان کی شکل ہوتی ہے نہ اعضاؤ جوارح وغیرہ۔ پھر بہت جلد اس میں تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں، حالانکہ وہ رحم کی تاریکیوں میں ہوتا ہے۔ پس وہ ہر روز ایک نئی شکل میں آتا ہے اور آہستہ آہستہ ظاہری حسن وجمال اور باطنی محکم ترکیب پر مشتمل ایک انسان بن جاتا ہے۔"

عجیب بات یہ ہے کہ یہ ساری نقش نگاری پانی پر ہوتی ہے۔ حالانکہ مشہور یہ ہے کہ پانی پر کوئی نقش نہیں بنتا اور کہا جاتا ہے کہ پانی پر کون تصویر بنا سکتا ہے؟ بہرحال جب جنین ابتدائی تغیرات کی منزلیں طے کر کے پہلی صورت اختیار کرتا ہے تو وہ شہتوت کے پھل کی طرح ہوتا ہے جس کے دانے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ماہرین اس کو "مرولا" کہتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جبکہ جنین کی ناف اس کی ماں کے قلب کی شریانوں اور ورید (یعنی خون کی نالی) سے مل جاتی ہے اور جنین کو ماں کے خون سے غذا ملنے لگتی ہے۔ اس کے خلیات باہر کو بڑھنے لگتے ہیں اور اندر کی طرف ایک تدریجی خلا پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ماہرین کی اصطلاح میں "بلاستولا" کہلاتا ہے۔ پھر خلیات میں ٹھوس پن پیدا ہوتا ہے اور وہ مستطیل کنارے دار شکل کا ہو جاتا ہے۔ پھر درمیان میں گڑھا پیدا ہوتا ہے جس سے اس کا پیٹ اور سینہ الگ الگ نمایاں ہوتا ہے۔

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام مرحلوں میں اس کے تمام خلیات ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں لیکن جب بچہ صورت پذیر ہونے لگتا ہے تو ان ہی خلیات میں باہمی تغیر و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور مختلف قسم کے خلیات

سے جسم کے مختلف اعضاء کی تشکیل ہونے لگتی ہے۔ مثلاً اعصاب، آنتیں اور دورانِ خون کے اعضا ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ پورا انسان تیار ہو جاتا ہے۔

علاوہ بریں بعض ماہرین علم الحیات نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمائیں:

انسانی[1] ڈھانچہ دو نہایت کمزور خلیوں سے صورت پذیر ہوتا ہے۔ ایک حیوان منوی (یعنی جرثومہ) مرد کا اور نہایت چھوٹا سا انڈہ عورت کا ــــــ مرد کے مادۂ منویہ میں پچاس کروڑ جرثومے ہوتے ہیں جو رحم میں پہنچ کر انڈوں کی پیدائش کے مقام کی طرف دوڑتے ہیں جہاں تقریباً تین لاکھ انڈے ہوتے ہیں۔ یہ عمل اسی انداز میں ہوتا ہے جیسے کوئی فوج کسی قلعے پر حملہ آور ہوتی ہے۔ چنانچہ بہت سے جرثومے انڈوں کے بیرونی غلاف وغیرہ سے ٹکرا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ قربان ہو جانے والے جرثوموں کے ذریعے بنے ہوئے راستے سے کوئی ایک جرثومہ غلاف کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور نسوانی انڈے سے متصل ہو کر بچے کی تخلیق کا عمل شروع کر دیتا ہے۔

یہاں یہ عمل قابلِ توجہ ہے کہ عام طور پر انسانی جسم اس اجنبی جسم کو خارج کر دیتا ہے جو اس میں داخل ہو جائے لیکن یہاں اسکے برعکس عمل ہوتا ہے جس کے لیے طب جدید یہ بتاتی ہے کہ نسوانی جسم اس عمل کے لیے پہلے ہی تیار رہتا ہے اور اس کے اخلاط و مزاج میں ایسا تغیر واقع ہوتا ہے کہ وہ مردانہ جرثومہ منویہ کو بحفاظت انڈوں تک پہنچا دیتا ہے تاکہ تخلیق کا عمل پورا ہو۔

---

[1] یہ تمام اقتباسات ڈاکٹر خالص جلبی کی کتاب "الطب محراب الایمان" سے ماخوذ ہیں۔

منوی جرثومے اور نسوانی انڈے کے اتصال سے مشیمہ (یعنی وہ ظرف جس میں بچے کی خلقت کے مراحل طے ہوتے ہیں) وجود میں آتا ہے۔ پھر اس میں پھیپھڑا' قلب' خون وغذا پہنچانے کے لیے رگیں تصفیۂ خون کے لیے گردے اور ذخیرۂ ہارمون کے لیے غدود پیدا ہوتے ہیں جو مناسب غذاؤں کے ہضم کرنے اور نقصان دہ چیزوں سے بچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

زندگی خلیہ میں موجود ہوتی ہے اور یہی ابتدا ہے جس سے زندگی کے مدارج طے ہوتے ہیں۔ یہ پایا گیا ہے کہ زندگی کی ابتدا ایسی ترزگوں سے ہوتی ہے جن کو "فیروسات" کہتے ہیں اور وہ جمادات وحیوانات کے درمیان کی سی حیثیت رکھنے والی ہوتی ہیں کیونکہ جمادات کی طرح وہ شفاف ہوتی ہیں اور حیوانات کی طرح ان میں نشوونما ہوتا ہے اور غالباً زندگی کا راز گویا اسی پل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

نسوانی انڈے اگر چند ساعت تک منوی جرثومے سے مل کر بارآور نہ ہوں تو وہ مرجاتے ہیں اور تین سے پانچ دن تک منوی جراثیم کو انڈے نہ ملیں تو وہ بھی مرجاتے ہیں۔ یعنی انفصال وجدائی موت ہے اور اتحاد ویگانگت زندگی دیتا ہے۔

نسوانی انڈے اور منوی جرثومے کے درمیان جب بارآور اتحاد ہوجاتا ہے تو تخلیق پانے والے انسان کی نشوونما ایک ہی تسلسل سے نہیں ہوتی کیونکہ کبھی تو وہ بلاتمیز وتخصیص خلیات جمع کرتا ہے اور اس طرح بہت سے خلیات ایک ہی شکل کے اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ پھر ان میں تمیز وتخصیص کا عمل شروع ہوتا ہے اور خلیات کے ایک مجموعے سے مختلف اعضاء کا ظہور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جسم انسانی کا پورا تشخص حاصل ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا وزن بڑھتا

ہے اور پھر آخری مرحلے میں اس پر رونق آتی ہے تاکہ وہ اچھی صورت میں رحم سے باہر آئے۔ (اقتباس ختم ہوا)

احادیث مقدسہ

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ سعادت و شقاوت جنہیں انسان رحم مادر ہی میں پالیتا ہے، دو قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم وہ جو قضاءِ حتمی کے طور پر ہوتی ہے۔ یعنی انسان کے لیے اس کی پوری زندگی میں لازم رہتی ہے اور جدا نہیں ہوتی جیسے اس کی موت کہ اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی، مگر یہ کہ خدا چاہے۔

اس صورت میں ظرفِ رحم گویا اس کے لیے علت تامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ قسم ہے جو نہ تعلیمِ انبیاءؑ سے بدلتی ہے نہ طبعی وسائل سے ـــ خواہ اس کا تعلق جسم سے ہو جیسے بعض اعضاء کا نقص یا جسم کا رنگ اور خواہ وہ روح سے متعلق ہو جیسے جنون یا ضعف عقل اور طبعی بیوقوفی وغیرہ۔ اسی لیے حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "حماقت وہ مرض ہے جس کی کوئی دوا نہیں اور وہ بیماری ہے جو دُور نہیں ہوتی۔"

دوسری قسم وہ ہے جس کے لیے رحم مادر مناسب مٹی کی مانند ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ سعادت یا شقاوت ان حالات پر منحصر ہے جن میں اس کی نشوونما ہو سکے یا وہ زائل ہو جائے۔ یہ قابل تبدیلی ہوتی ہے یعنی اس کا امکان ہوتا ہے کہ وسائل تربیت وغیرہ کے ذریعے شقاوت کا ازالہ ہو سکے یا سعادت کو مستحکم کیا جا سکے مثلاً وہ ملکہ، شجاعت و کرم یا ملکہ، جبن و بخل جسے بچّہ رحم مادر میں بطور وراثت حاصل کرتا ہے۔ اسے وسائل تربیت سے بڑھایا جا سکتا ہے، اگر وہ ملکہ اچھا ہو اور اگر بُرا ہو تو اسے دُور کیا

جا سکتا ہے۔

یہ کوئی حتمی تقدیر نہیں ہوتی کیونکہ اس کو صحیح تربیت اور دیگر وسائل سے بدلا جا سکتا ہے ۔ مثلاً اگر بچہ بعض جسمانی امراض کو وراثت میں پاتا ہے تو صحیح علاج کے ذریعے اس کو دُور کیا جا سکتا ہے ۔ جیسے صالح ماں باپ کا بچّہ فطری طور پر صلاح وسعادت پاتا ہے لیکن پیدائش کے بعد اگر ماحول اچھا نہ ملے تو یہ صلاح وسعادت، فساد و شقاوت میں بدل سکتی ہے اور بُرے ماں باپ کا بچّہ صحیح تربیت اور اچھے ماحول کی بدولت نیک بن سکتا ہے۔

بہر حال رحمِ مادر میں سعادت و شقاوت کی یہ صلاحیتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن پیدائش اور بلوغ عقل و کمال کے بعد سعادت یا شقاوت کی راہ پر چلنے کے لیے جو اہم ترین محرّک ہے وہ انسان کا خود اپنا ارادہ ہے جس کی بنا پر اس کے انجام خیر یا انجام شر کا تعین ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ "حقیقتِ سعادت یہ ہے کہ انسان کے عمل کا خاتمہ سعادت پر ہو اور حقیقتِ شقاوت یہ ہے کہ اس کے عمل کا خاتمہ شقاوت پر ہو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی بچّہ رحمِ مادر میں وراثت کے طور پر شقاوت پاتا ہے تو اس کا اثر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ اس میں قبولیتِ فساد کی اسی طرح صلاحیت ہوتی ہے جیسے کسی مٹی میں بیج کو نشوونما دینے کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ مگر جب تک خود بچے کا ارادہ بُرائی اور فساد کو بروئے کار نہ لائے تب تک اس سے بُرائی اور فساد کا ظہور نہیں ہو سکتا۔

امرِ مذکور کی تائید اس حدیث نبوی ؐ سے بھی ہوتی ہے کہ "کبھی سعید (یعنی نیک بخت) شقی بن جاتا ہے اور کبھی شقی نیک بخت اور سعید

بن جاتا ہے۔" [1]

اور امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"نیک بخت وہ ہے جو دوسرے سے عبرت حاصل کرے اور بد بخت وہ ہے جو اپنی خواہش اور غرور کے فریب میں آجائے۔" [2]

حدیث نبوی کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ایسا شخص جو رحم مادر سے سعادت اور صلاح کی استعداد لے کر پیدا ہوتا ہے۔ وہ جوان ہو کر شقاوت کا راستہ اختیار کر کے شقی بن جاتا ہے اور کبھی وہ شخص جسے رحم مادر میں شقاوت اور بدکاری وراثت کے طور پر ملتی ہے وہ خود عقل و ہوش حاصل کر کے صحیح ماحول اختیار کرتا ہے اور اعمال صالح کے ذریعے سعید و خوش بخت بن جاتا ہے۔ اسی طرح امام علیہ السلام کا فرمان اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ اہل شقاوت کا برا انجام اس قابل ہے کہ دوسرے لوگ اس سے وعظ و نصیحت حاصل کریں اور اپنے آپ میں حسن ارادہ پیدا کر کے صحیح راستہ اختیار کریں۔ تاکہ خود سعید و نیک بخت بن جائیں خواہ ان میں وراثتی طور پر شقاوت ہی کیوں نہ رہی ہو۔

کتاب الکافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ جب اللہ عزوجل ایسے نطفے کو جس سے صلب حضرت آدمؑ میں میثاق لیا ہوتا ہے، عالم بشریت میں پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اس مرد میں جماع کی خواہش پیدا کرتا ہے جس کے صلب میں وہ نطفہ موجود ہوتا ہے اور

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۱ صفحہ ۱۰۴ [2] نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۱۴۹

اُس کی زوجہ کے رحم کو حکم دیتا ہے کہ اپنے دروازے کو کھول دے تاکہ اس بشر کی تخلیق سے متعلق حکم قضا و قدر نافذ ہو۔ پس دروازۂ رحم کھل جاتا ہے اور نطفہ اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر چالیس دن تک وہ وہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلتا رہتا ہے۔ پھر وہ ایسا گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے کہ جس میں رگوں کا جال ہوتا ہے۔ پھر اللہ دو فرشتوں کو بھیجتا ہے جو عورت کے منہ کی راہ سے اس کے رحم میں داخل ہو جاتے ہیں، جہاں وہ عمل تخلیق جاری کرتے ہیں۔ اس گوشت کے لوتھڑے میں وہ قدیم روح جو اصلاب و ارحام سے منتقل ہوتی ہوئی آتی ہے بطور صلاحیت و استعداد موجود ہوتی ہے۔ پس فرشتے اس میں زندگی و بقا کی روح پھونک دیتے ہیں اور باذن اللہ اس میں آنکھ، کان اور دوسرے تمام اعضاء بنا دیتے ہیں۔ پھر اللہ ان دونوں کو وحی کرتا ہے کہ "اس پر میری قضا و قدر اور نافذ امر کو لکھ دو اور جو کچھ لکھو اس میں میری طرف سے بداء کی شرط بھی لگا دو۔"

تب وہ فرشتے کہتے ہیں: "اے پروردگار! ہم کیا لکھیں؟"

پروردگار ان کو حکم دیتا ہے: "اپنے سروں کو اس کی ماں کے سر کی طرف اٹھاؤ۔ پس وہ فرشتے جب سر اٹھا کر اُدھر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لوحِ تقدیر اس کی پیشانی سے ٹکرا رہی ہے، جس میں نومولود کی صورت و زینت اُس کی مدتِ حیات اور اس کے شقی یا سعید وغیرہ ہونے کے بارے میں سب کچھ لکھا ہوتا ہے۔ پس ان فرشتوں میں سے ایک دوسرے کے لیے پڑھتا ہے اور دونوں لکھتے ہیں وہ سب کچھ جو اس نومولود کی تقدیر میں ہوتا ہے اور بداء کی شرط بھی وہ لکھتے جاتے ہیں۔" [1]

---

[1] فروع الکافی جلد ۶ صفحہ ۱۴

اس مقام پر ہمارے لیے مناسب ہے کہ ہم بعض الفاظِ حدیث کی بھی وضاحت کردیں۔ پس گزارش ہے کہ نومولود کی لوحِ تقدیر کے پیشانیٔ مادر سے ٹکرانے کا جو ذکر ہے وہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ماں کی نفسیاتی کیفیتوں، اُس کے پوشیدہ افکار، اس کی ذہنیت، عقل، صفات اور اس کے اخلاق کا نومولود کی شخصیت پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور فرشتوں کے لکھنے سے یہ مراد ہے کہ نومولود میں اس کی ماں کی طرف سے بہت سی صفتیں منتقل ہوتی ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچے کا جسم اس کے والدین کی بہت سی صفات میں ان کا تابع ہوتا ہے، خصوصاً ماں کی صفات کا! کیونکہ اس کا رحم ہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں اس پر تخلیقی تغیرات واقع ہوتے ہیں۔

طبِ جدید کی تحقیقات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ انسان پر جو تاثرات اور نفسیاتی کیفیات طاری ہوتی ہیں، خواہ وہ اس کے اختیار میں ہوں، خواہ بے اختیارانہ طور پر ہوں۔ ان کا مرد اور عورت دونوں ہی پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور یہ اثر مرد و عورت کے ذریعے ان کے نومولود بچے پر بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی بعض ایسے اثرات بھی ہوتے ہیں جن سے نومولود کی خلقت میں کوئی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس علم کے ماہرین کی طرف سے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ جنسی مقاربت یعنی جماع کے وقت مرد اور عورت دونوں کو نہایت اطمینان اور راحتِ سرور اور انبساط کی حالت میں ہونا چاہیے تاکہ اگر نتیجے میں حمل واقع ہو تو وہ بُرے اثرات سے محفوظ رہے۔

جہاں تک امام علیہ السلام کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ فرشتے جو کچھ لکھتے ہیں اس میں بداء کی شرط بھی لگاتے ہیں تو اس میں یہ واضح دلیل موجود ہے کہ رحمِ مادر میں سعادت و شقاوت کی صلاحیتوں کے بارے میں جو کچھ استعداد

پیدا ہوتی ہے وہ حتمی ولازمی نہیں ہوتی، اس طرح کہ نومولود اس سعادت یا شقاوت کی بنا پر اپنے عمل میں مجبور ہو۔ بلکہ اس کی حیثیت صرف صلاحیت و استعداد تک محدود ہوتی ہے، جسے عملی کوشش اور دوسرے حالات کے ذریعے بدلا جاسکتا ہے۔

علاوہ بریں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ رحم مادر میں نومولود میں جو صفتیں پیدا ہوتی ہیں وہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کی نوعیت حتمی ہوتی ہے اور دوسری وہ جو غیر حتمی ہوتی ہیں جن کے لیے رحم مادر کسی کھیت کی مناسب مٹی کی طرح ہوتا ہے کہ اگر دوسرے اسباب بھی مہیا ہوں تو بیج نشوونما پاتا ہے۔

حدیث شریف میں اسی آخری قسم کی صفتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جن میں تبدیلی وتغیر کا امکان باقی رہتا ہے کیونکہ انسان فاعل مختار اور اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ اس کی عملی زندگی میں خدا کی طرف سے اس پر کوئی جبر نہیں ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کی مختلف آیات اور ائمہ معصومینؑ کی احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو لوحیں پیدا کیں جن میں ساری کائنات میں ہونے والے حوادث مرقوم ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "لوح محفوظ" ہے جس میں لکھی ہوئی باتوں میں اصلاً تغیر و تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے ازلی علم کے مطابق حتمی طور پر وقوع پذیر ہوتی ہیں جبکہ دوسری کا نام 'لوح محو و اثبات' ہے جس میں ایک چیز لکھی جاتی ہے اور پھر حکمت و مصلحت کی رو سے یہ مٹائی بھی جاسکتی ہے۔ اس کے فوائد اہل عقل و بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم

کہیں کہ اس لوح میں زید کی عمر پچاس سال لکھی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکمت کا تقاضا تو یہی ہے کہ زید کی عمر پچاس سال ہی ہو، بشرطیکہ اس عمر کو گھٹانے یا بڑھانے والا کوئی کام اس نے انجام نہ دیا ہو، مثلاً اگر اس نے صلہ رحمی کی تو پچاس سال کو مٹا کر اس کی عمر ساٹھ سال کر دی جائے گی، جبکہ وہ قطع رحمی کرے تو اس کی عمر چالیس سال کر دی جائے گی لیکن لوح محفوظ میں یہ بات اس طرح لکھی گئی ہے کہ وہ صلہ رحمی کرے گا اور اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی۔ جیسے کوئی ماہر طبیب کسی آدمی کے مزاج کا معائنہ کر کے بتائے کہ اس کے مطابق وہ ساٹھ سال کی عمر پائے گا۔ پس وہ آدمی اگر زہریلی شراب پی لے یا کوئی دوسرا اس کو مار ڈالے تو اس کی عمر کم ہو جائے گی یا پھر اس نے ایک مقوی دوا استعمال کی جس سے اس کا مزاج قوی و مضبوط ہو گیا تو اس کی عمر بڑھ جائے گی۔ بہر صورت اس ماہر طبیب کی رائے کے برخلاف کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

یوں اس لوح میں جو تغیر و تبدل واقع ہوا اس کو بداء کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی آزمائش، مذاق اور تمسخر وغیرہ کی طرح اللہ تعالیٰ کے حق میں مجازاً بولا جاتا ہے یا اس کو بداء اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے ملائکہ اور مخلوقات کو پہلی خبر ملنے کے بعد نیا علم حاصل ہوا جو پہلے ان کو حاصل نہیں تھا۔

اس قسم کی دو لوحوں کا موجود ہونا ناممکن یا محال نہیں ہے کہ اس میں مختلف قسم کی تاویل و تکلف کی ضرورت پڑتی۔ لہٰذا اگر اس امر کی حکمت ہم پر ظاہر نہیں ہوئی تو جان لینا چاہیئے کہ ہماری عقل ان حکمتوں کو سمجھنے سے عاجز ہے۔[1]

---

[1] بحارالانوار جلد ۴

بفضلہ تعالیٰ انسانی زندگی کے تیسرے مرحلے سے متعلق ہم جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ تمام ہوا اور اب (حاشیہ بداء کے بعد) چوتھا مرحلہ شروع ہوگا۔

مسئلہ بداء

مسئلہ بداء چونکہ مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ سے ہی ایک اختلافی مسئلہ رہا ہے۔ لہٰذا ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں معنیٰ بداء اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کے بارے میں کچھ حقیقتیں پیش کردیں۔

لفظِ بداء عربی زبان کا لفظ ہے اور ایک فعلِ ثلاثی مجرد کا مصدر ہے۔ اس کا فعل ماضی "بَدَا" اور فعل مضارع "یَبْدُوْ" سے ماضی و مضارع کی گردانوں میں شروع ہوتا ہے۔ (دیکھیے تاج العروس جلد ۱۰ صفحہ ۳۱۔ القاموس جلد ۴ صفحہ ۳۰۲ اور لسان العرب جلد ۴ صفحہ ۶۵)

اس فعل کے دوسرے مصادر بداء — بداوۃ اور بدوا — بھی ہیں۔ بہر طور اس کے معنی ہیں ظاہر ہونا یا کھل جانا یا آشکار ہونا یعنی کسی چیز کا پوشیدہ ہونے کے بعد ظاہر ہو جانا۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

"وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوْا"

(سورۂ زمر۔ آیت ۴۸)

یعنی "ظاہر ہوگئیں اُن کے لیے (آخرت میں) بُرائیاں اُن اعمال کی جن کے وہ مرتکب ہوئے تھے" جبکہ دنیا میں وہ بُرائیاں اُن پر پوشیدہ تھیں۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ"

(سورۂ زمر۔ آیت ۴۷)

یعنی "اور ظاہر ہوا ان کے لیے اللہ کی طرف سے وہ جس کا وہ گمان نہیں کرتے۔"

پس معلوم ہوا کہ بداء کے یہ معنی ظاہر و منکشف ہونے کے ہیں لیکن یہ معنی صرف انسان کے لیے درست ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک اللہ عزوجل کا تعلق ہے تو اس کی طرف اس معنی کی نسبت محال اور ناممکن ہے۔ کیونکہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ گویا اللہ نے کسی چیز کو جان لیا بعد اس کے کہ وہ اس سے جاہل تھا۔ معاذ اللہ، اور یہ ناممکن بھی ہے اور لغو بھی۔ اس لیے کہ خالق عالم تمام چیزوں کو ازل سے جانتا ہے۔ ان چیزوں کی پیدائش سے پہلے ہی۔

یاد رہے کہ اس کا علم عینِ ذات ہے اور وہی ذات واجب الوجود ہر چیز کی علت ہے۔ پس چونکہ علت کا علم مستلزم ہوتا ہے معلول کے علم کے لیے لہٰذا ہر معلول یعنی ہر چیز اس کے علم میں ہے۔ غرضیکہ جمیع موجودات کا اس کو علم ہے اور وہ ذات گرامی اپنے علم و قدرت سے جمیع موجودات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، جبکہ وہ خود لا محدود ہے۔ لہٰذا اس کی طرف کسی بھی طرح جہل کی نسبت نہیں دی جا سکتی۔

یہ حقیقت عقل سے بھی ثابت ہے اور آیاتِ قرآنیہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اللہ نگاہوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور ان چیزوں کو بھی جو دلوں کے پردے میں ہوتی ہیں۔"

(سورۂ مومن۔ آیت ۱۹)

"اور خدا ہی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔"

(سورۂ نساء۔ آیت ۱۲۶)

"اللہ ان تمام چیزوں کو جانتا ہے جو خشکی اور تری میں ہیں اور نہیں گرتا کوئی پتا مگر یہ کہ اللہ اسے بھی جانتا ہے۔"

(سورۂ انعام۔ آیت ۵۹)

پس ائمہ اہل بیت صلوٰۃ اللہ وسلامہٗ علیہم اور ان کے شیعہ پروردگارِ عالم کی طرف لفظِ بداء کی نسبت ہرگز اس معنی میں نہیں کرتے کہ کوئی چیز اس کی نگاہ و قدرت سے پوشیدہ تھی' پھر ظاہر ہو گئی یا یہ کہ کوئی چیز اسے معلوم نہ ہونے کے بعد معلوم ہو گئی۔ معاذ اللہ! بلکہ وہ اس قسم کے ہر تصوّر سے اظہارِ برائت کرتے ہیں۔

لہٰذا جہاں تک اس معنی کا تعلق ہے جس کے اعتبار سے لفظ بداء کی نسبت اللہ عزّوجل کی طرف دی جا سکتی ہے تو اس کی حیثیت تکوینی امور میں ویسی ہی ہے جیسے تشریعی امور میں نسخ کی ہوتی ہے اور نسخ کے معنی ہیں کسی ایسے حکم شرعی کا زمانہ ختم ہو جانا جو بظاہر ہر زمانے کے لیے معلوم ہوتا تھا۔ مگر شارع علیہ السلام کو معلوم تھا کہ یہ ایک محدود مدت تک کے لیے ہے۔ نسخ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حکم شرعی تو درحقیقت ہر زمانے کے لیے تھا مگر بعد میں شارع کو اس کے غیر صالح ہونے کا علم ہوا تو انھوں نے اسے منسوخ کر دیا۔

پس صحیح طور پر بداء کے یہ معنی ہیں کہ کسی امر تکوینی کے تسلسل و استمرار کا اپنی قدرتی انتہا کو پہنچ جانا' یہ بات یاد رہے کہ فیضانِ الٰہی کا کسی چیز کے بارے میں اللہ کی طرف سے متعین حد تک پہنچ جانا اور بات ہے اور کسی چیز کو ثابت کر کے پھر اسی کو لغو قرار دینا اور بات ہے۔ یہ آخری صورت لفظ بداء سے ہرگز مراد نہیں ہوتی۔[1]

---

[1] دیکھیے کلام سید داماد بحار الانوار جلد ۴ صفحہ ۱۲۶ طبع طہران

مذکورہ حقیقت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نسخ کے معنی ہیں کسی ایسے حکمِ شرعی کے زمانۂ مخصوص کا ختم ہو جانا جو بظاہر باقی رہنے والا معلوم ہوتا تھا یا یوں کہیے کہ وہ حکم شرعی محض اس وقت تک کے لیے تھا جب تک ناسخ نہ آگیا اور جب ناسخ آگیا تو معلوم ہو گیا کہ پہلے حکم شرعی کی مدت ختم ہو گئی۔ مثلاً کوئی حکم جب عمومی طور پر صادر ہوا تو اس سے متعلق تمام انواع و افراد کا شامل ہونا معلوم ہوتا تھا۔ مگر تخصیص ہونے کے بعد پتا چلا کہ تمام انواع و افراد میں صرف ایک ہی حصّہ اس حکم سے متعلق ہے۔

اسی طرح بداء کے صحیح معنی یہ ہیں کہ کسی امر تکوینی کے لیے فیضانِ الٰہی اپنی مقررہ مدّت کو پہنچ گیا۔ یعنی اُس کا تسلسل و استمرار منقطع ہو گیا۔ لہٰذا اس معنی میں نہ کسی مخفی بات کا ظاہر ہونا مضمر ہے نہ کسی جہالت کے بعد علم کا آجانا۔ بلکہ بداء درحقیقت کسی چیز کے زمانۂ وجود کے محدود اور منتہی ہونے کا نام ہے اور اس مخصوص معنی میں بداء "کتاب محو و اثبات" میں جاری ہوتا ہے اس حتمی کتاب میں نہیں جو "لوح محفوظ" کہلاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ خالقِ کائنات کی بارگاہ میں دو کتابیں ہیں۔ ایک "لوح محفوظ" جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور دوسری "کتاب محو و اثبات" جس میں تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے اور اسی میں بداء واقع ہوتا ہے۔[1]

قرآن مجید میں اللہ نے ان دونوں کتابوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وہ فرماتا ہے:

"اللہ جسے چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اللہ کے پاس ام الکتاب بھی ہے۔" (سورۂ رعد۔ آیت ۴۰)

---

[1] یعنی اسی آخری کتاب کے نوشتے میں تبدیلی کو بداء کہتے ہیں۔ (مترجم)

لفظِ 'کتاب' قرآن مجید کی کئی سورتوں میں آیا ہے: سورہ الزخرف آیت ۴۔ سورہ النحل آیت ۷۵۔ سورہ فاطر آیت ۱۱۔ سورۂ یونس آیت ۶۱ اور سورہ الحدید آیت ۲۲۔

ان تمام آیات میں یہی کہا گیا ہے کہ "اس کتاب" میں تمام موجودات' چھوٹے بڑے اور کلی وجزئی سب مذکور ہیں۔ اس مقام پر ہم یہ نہیں بیان کرنا چاہتے کہ "کتاب" سے مراد کیا ہے۔ بلکہ یہ عرض کرنا ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں دو کتابیں ہیں۔ "کتاب محو و اثبات" اور "لوح محفوظ" پہلی کتاب کی تحریر میں تبدیلی ممکن ہے مگر دوسری میں نہیں۔ جیسا کہ سورۂ رعد کی آیت ۳۹ میں بیان ہوا ہے۔

تفسیر "مجمع البیان" میں ہے کہ "محو و اثبات کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ عمل ہر چیز میں جاری ہوتا ہے۔ پس رزق' موت اور سعادت و شقاوت سب ہی میں محو و اثبات کا عمل ہوتا ہے۔ ابوقلابہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ وہ دعا میں کہا کرتے تھے:

" خدایا! اگر تو نے مجھے اشقیاء میں سے لکھا ہو تو اسے محو کردے اور مجھے سعید لوگوں میں لکھ دے۔ کیونکہ تو جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور تیرے پاس ام الکتاب بھی ہے۔"

اسی طرح کے دعائیہ کلمات ہمارے ائمہ طاہرین علیہم السلام سے بھی منقول ہیں اور عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا:

" بارگاہ الٰہی میں دو کتابیں ہیں۔ ام الکتاب کے علاوہ ایک دوسری کتاب بھی ہے جس میں محو و اثبات واقع ہوتا ہے جبکہ ام الکتاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

ابن عباس کے علاوہ بعض دوسرے صحابہ نے یہی بات پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے۔[1]

سورہ الدخان کی آیت ۴ "اور اس (رات) میں ہر امرِ حکیم کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔" اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں صاحب مجمع البیان نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر سال شبِ قدر میں ہر امر کے بارے میں فیصلہ صادر فرماتا ہے۔ مگر بداء اور مشیّت کی شرط کے ساتھ کہ موت، رزق اور بلیات و امراض وغیرہ میں اگر وہ چاہے گا تو تقدیم و تاخیر یا زیادتی و کمی کر دے گا۔ اللہ جل شانہٗ کے ان فیصلوں کو رسول اللہ امیر المومنینؑ کی طرف بھیجتے ہیں اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام دوسرے ائمۂ طاہرین علیہم السلام کی طرف روانہ کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ سلسلہ بسلسلہ امامِ زمانہؑ تک وہ فیصلے پہنچتے ہیں اور ان میں بداء و مشیّت اور تقدیم و تاخیر کی شرط ہوتی ہے۔[2]

پس معلوم ہوا کہ تقدیرِ حتمی میں تو کوئی بداء واقع نہیں ہوتا۔ البتہ تقدیر غیر حتمی (جو مختلف شرطوں کے ساتھ مشروط ہوتی ہے) اس میں بداء واقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ ائمۂ طاہرینؑ کی دعاؤں وغیرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

لہٰذا بداء در حقیقت منزلِ تکوین میں وہی مقام رکھتا ہے جو منزلِ تشریع میں نسخ کا مقام ہے۔ جیسا کہ سید داماد رحمۃ اللہ نے افادہ فرمایا ہے۔ یعنی امرِ تکوینی میں بداء، حکمِ تشریعی کے منسوخ ہونے کی مانند ہے۔ اس میں نہ خفا کے بعد کوئی ظہور ہوتا ہے نہ جہل کے بعد علم۔

---

[1] مجمع البیان طبرسیؒ۔ تفسیر سورۂ رعد آیت ۴۰

[2] مجمع البیان طبرسیؒ۔ تفسیر سورہ الدخان آیت ۴

نیز نفوسِ کلیۂ عالیہ رکھنے والے حضرات جیسے نبی و وصی پر ایسے مخفی امور منکشف ہو جاتے ہیں جن کی بنا پر وہ کوئی حکم لگاتے ہیں۔ پھر کبھی ان کے حکم کے خلاف اگر کوئی امر ظاہر ہوتا ہے تو وہ محض اس وجہ سے کہ جس شرط کی بنا پر انھوں نے حکم لگایا تھا وہ شرط زائل ہو گئی۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

مثلاً اُس یہودی کا قصہ جس کے بارے میں حضرت ابو عبداللہ الصادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: "ایک یہودی نبی اکرمؐ کے پاس سے گزرا اور اُس نے آنحضرتؐ پر یوں سلام کیا: "اَلسَّامُ عَلَیْکَ" (جس کے معنی ہیں کہ تم پر موت آئے)۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "وَ عَلَیْكَ" (یعنی اور تجھ پر)۔

آپ کے اصحاب نے کہا: "اس نے تو آپ کے لیے موت کی بددعا کی!"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "میں نے اُس پر موت کو لوٹا دیا ہے۔ ایک کالا سانپ اس کی پشتِ گردن پر ڈسے گا اور یہ ہلاک ہو جائے گا۔"

وہ یہودی جنگل میں گیا اور اس نے بہت سی سوکھی لکڑیاں جمع کیں۔ پھر ان کو باندھ کر اپنے سر پر لیے ہوئے زندہ واپس آیا۔ آنحضرتؐ نے اس سے کہا: "ان لکڑیوں کو زمین پر رکھ دے۔" یہودی نے جب لکڑیوں کا گٹھا زمین پر ڈالا تو اس میں سے ایک کالا سانپ نکلا جو لکڑیوں پر دانت مار رہا تھا۔ آنحضرتؐ نے اس سے پوچھا: "کیا تو نے کوئی نیک کام کیا ہے؟" اس نے کہا: "میں نے تو بس یہ لکڑیاں جمع کیں اور ان کو اٹھا کر لایا ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ میرے پاس دو میٹھی روٹیاں تھیں۔ جن میں سے ایک میں نے خود کھائی اور دوسری ایک مسکین کو صدقے کے طور پر دیدی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسی وجہ سے اللہ نے تجھ سے موت کو دفع کر دیا۔ یقیناً صدقہ بُری موت کو دفع کر دیتا ہے۔" [1]

اسی طرح کا واقعہ جناب ابراہیم خلیل اللہؑ کا ہے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ گویا وہ اپنے فرزند جناب اسماعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں۔ یہ خواب جناب ابراہیمؑ کے لیے بمنزلۂ وحی تھا۔ لہٰذا آپ نے اسے اپنے فرزند کو سنایا۔ جناب اسماعیلؑ نے کہا: "جس امر کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اُسے پُورا کیجیے۔" اور وہ ذبح ہونے کو تیار ہو گئے۔ جناب ابراہیمؑ بھی اپنے فرزند عزیز کو ذبح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور بیٹے کو بھی لٹا دیا۔ مگر ربِّ جلیل کی آواز آئی:

"ابراہیمؑ! تم ہمارا حکم بجا لائے۔ پس اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو اب ذبح نہ کرو۔ ہم نے ان کا فدیہ ذبحِ عظیم سے دیدیا ہے۔" (سورہ الصافات۔ آیات ۱۰۲ تا ۱۰۷)

معلوم ہوا کہ ذبحِ حضرت اسماعیلؑ کا حکم فدیہ نہ دینے پر معلق تھا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ شرط معلوم نہیں تھی۔ اسی طرح جیسے آنحضرتؐ نے اس یہودی کی موت کا حکم لگایا تھا وہ صدقہ نہ دینے کی حالت میں مقدر تھی۔ جب اس نے صدقہ دیدیا تو موت ٹل گئی۔

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بداء درحقیقت حتمی قضاءِ الٰہی (یعنی علم الٰہی) میں نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف نفوس کلیہ الٰہیہ رکھنے والوں یعنی نبی و امام معصومؑ کے علم میں ہوتا ہے تو پھر اسے اللہ کی طرف کیوں منسوب کرتے

---

[1] بحار الانوار جلد ۴ صفحہ ۱۲۱

ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں معاملے میں اللہ کے لیے بداء واقع ہوا؟

تو اس کے جواب میں میں کہوں گا کہ عالم جسمانی میں جتنے حوادث رونما ہوتے ہیں ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اسی طرح ہوتی ہے جیسے کسی کو اس کے متعلق کی صفت سے موصوف کیا جائے۔ مثلاً کوئی کہے کہ: "میرے پاس وہ مرد آیا جس کا باپ کریم النفس ہے۔" تو یہاں بیٹے کو اس کے باپ کی صفت سے موصوف کر دیا گیا اور چونکہ اس عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ کے ارادے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ افعال جو ہم سے صادر ہوتے ہیں ان کو مجازی طور پر اللہ کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔

پس یہ کہنا کہ "اللہ تعالیٰ کے لیے فلاں معاملے میں بداء واقع ہوا" اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے لیے اس معاملے میں وہ ظاہر ہوا جو پہلے مخفی تھا۔ یعنی یہ ظاہر ہونے کی بات درحقیقت دوسروں کے لیے ہے، اللہ کے لیے نہیں۔ تو یاد رکھنا چاہیے کہ بداء بمعنی ظہور انسان کے لیے ہے اللہ کے لیے نہیں ہے۔

اس حقیقت کو "سمیع و بصیر" جیسی صفتوں سے سمجھیے کہ ان صفتوں سے انسان کو بھی موصوف کیا جاتا ہے اور اللہ کو بھی۔ حالانکہ یہ صفتیں جس طرح انسان میں پائی جاتی ہیں، اللہ جل شانہٗ میں ہرگز اس طرح نہیں پائی جاتیں۔ کیونکہ انسان تو اعضاء جسمانی کے ذریعے سنتا اور دیکھتا ہے۔ مگر اللہ عزوجل جسم و جسمانیات سے منزّہ و پاک ہے اور وہ سمیع ہے تو اپنے علم سے اور بصیر ہے تو اپنے علم سے اور علم اس کی عین ذات ہے یعنی اس کی صفت اور اس کی ذات گرامی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس کی صفتیں نہ اسکی

ذات واجب سے جدا ہیں نہ زائد بر ذات ہیں بلکہ عینِ ذات ہیں۔

جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے تو ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو اللہ کے لیے بھی بولے جاتے ہیں۔ ایسے ہی الفاظ میں سے یہ لفظِ بداء بھی ہے۔

پس امید ہے کہ ان توضیحات سے اس حدیث شریف کا مطلب واضح ہو گیا ہو گا جس میں معصوم نے فرمایا ہے کہ "بطنِ مادر میں دو فرشتے شرطِ بداء کے ساتھ نومولود کے بارے میں قضا و قدر کے فیصلے لکھتے ہیں"۔

اس ارشادِ امام کا مطلب یہ ہے کہ نومولود کی شقاوت یا سعادت جسے وہ بحکم قضا و قدر اپنے والدین سے وراثت میں پاتا ہے۔ ان کا دوام حتمی و جبری نہیں ہوتا (بالخصوص اعمال و کردار اختیاری کے بارے میں) لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ اگر والدین شقی ہوں تو نومولود بھی حتماً شقی ہی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بداء ظاہر ہوتا ہے۔

یہی حقیقت ہمارے ائمہ طاہرینؑ کی ان دعاؤں سے ظاہر ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے: "خدایا! اگر تو نے مجھے اشقیاء میں شمار کیا ہو تو اسے محو کر دے اور مجھے سعادت مندوں میں لکھ لے کیونکہ تو محو کر دیتا ہے جس چیز کو محو کرنا چاہتا ہے اور ثابت رکھتا ہے جسے ثابت رکھنا چاہتا ہے اور تیرے پاس ام الکتاب بھی ہے"۔

پس آیاتِ محو و اثبات اور قضا و قدر کے بارے میں تغیر و تبدل واقع ہونے سے متعلق جو حدیثیں وارد ہیں ان میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

عالمِ دنیا

یعنی وہ دنیا جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اور جو زمین، پانی اور ہوا وغیرہ سے مرکب ہے، اپنی تمام نیکی بدی اور سعادت و شقاوت کے ساتھ۔

اس دنیا میں انسان کے لیے اہمیت اس امر کی ہے کہ وہ یہاں ایک بھرپور اور دیرپا زندگی بسر کرے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے مقصد کی راہ میں تگ و دو کرتا رہتا ہے خواہ اس کا مقصد حیات مادی ہو خواہ معنوی و روحانی۔ وہ اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے وسیلے استعمال کرتا ہے تاکہ کامیابی کی سعادت حاصل کرے۔ کوئی مادی راہ اختیار کرتا ہے تو کوئی روحانی۔

مادی گروہ

مادی راہ اختیار کرنے والوں کو ہم تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ پہلا گروہ ایسے لوگوں کا جو کمال و پائداریٔ حیات کو صرف مال جمع

کرنے اور کثرتِ ثروت میں منحصر سمجھتے ہیں کیونکہ وہ گمان کرتے ہیں کہ مال کے ذریعے ذاتی استغنا رحاصل ہوتا ہے اور ذاتی استغناء کمال و پائداریٔ حیات کا ذریعہ ہے۔

۲۔۔۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو عزت وجاہ اور بلندیٔ مرتبہ میں کمالِ زندگی کا راز مضمر سمجھتے ہیں لیکن یہ چیزیں کسی بڑے خاندان یا بڑے قبیلے کی طرف نسبت کے بغیر کم حاصل ہوتی ہیں۔

۳۔۔۔ تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ استغناء ذاتی معزز افراد اور بڑی جماعتوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مالِ کثیر بھی خرچ کرتے ہیں اور اپنے روابط بڑھانے کے لیے جدوجہد بھی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی مناسب موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

مذکورہ قسم کی تمام راہیں خالصتاً مادی ہیں جن میں روحانیت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے لوگوں کا نقطۂ نظر صرف مادی ہوتا ہے۔

روحانی گروہ

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو زندگی کے روحانی پہلو کو اہمیت دیتے ہیں تو وہ کمال و تکامل زندگی کو اس امر میں مضمر سمجھتے ہیں کہ روحانیت کی بالادستی کے لیے دنیوی زندگی کی سختی و تنگی کو بھی برداشت کیا جائے۔ ان لوگوں کو بھی تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔۔۔ پہلا گروہ ان لوگوں کا جنہوں نے ارسطو سے پہلے والے فلاسفۂ یونان کی پیروی کی اور یہ تصور کیا کہ تکامل زندگی و سعادتِ بشری ان کمالاتِ

نفسیہ کی راہ سے حاصل ہونیوالی چیزیں ہیں جن کی بنیاد چار چیزوں یعنی حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت پر ہے۔ پس جو شخص ان چاروں صفتوں کو اپنے میں جمع کر لے وہ ان کے نزدیک پورا سعادتمند اور محفوظ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جسمانی کمالات کو کسی کمال تک پہنچنے میں مؤثر نہیں سمجھتے۔ پس اگر کوئی شخص کسی عضوِ جسمانی سے محروم ہو یا کسی مرض میں مبتلا ہو، تب بھی اس کے لیے مذکورہ چار صفاتِ کمال تک پہنچنے میں کوئی مانع نہیں ہے کیونکہ امراض و عوارضِ جسمانیہ حصولِ سعادت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔

۲۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو "مرتاضین" یعنی ریاضت و مجاہدۂ نفس کرنے والے کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ خواہشاتِ نفس اور دنیوی لذتوں سے اپنے نفس کو روکے رکھنے ہی میں سعادت و کمالِ زندگی کا راز مضمر سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لوگ اپنے جسم کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ کبھی نوکیلی میخوں پر لیٹ کر کبھی درختوں کی شاخوں سے اپنے آپ کو لٹکا کر اور کبھی تیز دھوپ میں بیٹھ کر۔ نیز یہ لوگ کھانا پینا ترک کر کے بھی ریاضت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ماقبل ارسطو کے فلسفیوں سے بھی بڑھے ہوتے ہیں کیونکہ یہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ جسمانی نشوونما کی طرف سے بے پروائی برتیں بلکہ یہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر جسم کو عذاب و اذیت پہنچانے کے ذریعے روحانی سعادت طلب کرتے ہیں۔

۳۔ تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو سعادت و تکاملِ حیات تک پہنچنے کا راز اس امر میں مضمر سمجھتے ہیں کہ انسان اپنے کو ان امور

سے بلند تر رکھے جن میں انسان اور دوسرے حیوانات و بہائم مشترک ہوتے ہیں۔ مثلاً جنسی و شہواتی خواہشات جن کے غالب آنے سے انسان، ان کے اعتقاد کے مطابق حیوانات و بہائم کی سطح تک پست ہو جاتا ہے اور یہ بات سعادتِ انسانیہ کی حدوں سے خارج ہے۔ لہذا ان کا ترجمان کہتا ہے کہ "وہ چیزیں جن میں انسان اور دوسرے حیوان برابر ہوتے ہیں، ان میں ہم انسانوں کے لیے کوئی سعادت نہیں!"

ظاہر ہے کہ یہ آخری گروہ مذکورہ بالا دونوں گروہوں کے درمیان کسی قدر اعتدال پسند ہے کیونکہ نہ ان لوگوں کے نزدیک جسمانی نشو و نما سے غفلت برتنا ضروری ہے نہ جسم کو عذاب و اذیت میں مبتلا کرنا۔

اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ تینوں گروہ اس امر میں مشترک ہیں کہ جسمانی ترقی و فروغ کے مقابلے میں روحانیت کے فروغ و کمال کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے خواہ اس کے ذرائع کے بارے میں ان کا باہمی اختلاف ہے۔[1]

تکامل حیات کی راہ

مذکورہ بالا بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعادت و تکامل حیات کے بارے میں دو متضاد قسم کے مکاتب فکر ہیں۔ ایک وہ جو مادیت پر مبنی ہے اور دوسرا وہ جو روحانیت کے فروغ پر قائم ہے۔ پہلا مکتب فکر مادی ترقی کو سعادت

---

[1] روحانی گروہوں کی یہ تقسیم شیخ محمد تقی فلسفی کی کتاب "الطفل بین الوراثة والتربیة" سے ماخوذ ہے۔

اور کمال سمجھتا ہے اور دوسرا روحانی ترقی کو۔

موجودہ دور کی تہذیب و شہریت مادیت کی طرف مائل ہے اور مادی خواہشات و لذات کی تکمیل ہی کو اصل حیات تصور کرتی ہے۔ اس حد تک کہ مادیت انسان کی عقل و فکر سب پر غالب آجاتی ہے۔

لیکن ان مادی و روحانی دونوں نظریات کی افراط و تفریط کے درمیان سے وہ صحیح حقیقت روشن ہوتی ہے جو واقعی سعادت و تکامل حیات کی راہ ہے۔ یعنی ــــ انسان روح و مادہ دونوں ہی کی ترقی اور بہتری کا راستہ اختیار کرے۔ یہی فطرت سلیمہ ہے اور یہی قانونِ فطرت و طبیعتِ انسانی ہے کیونکہ نیکی کرنے اور پیدا کرنے والے کی رضا حاصل کرنے کے لیے جسم کی طرف توجہ دینا روحانیت کے فروغ کی راہ میں حائل نہیں ہوتا اور اس سے نفس و روح پر کوئی ظلم نہیں ہوتا ہے بلکہ یہی وہ بہترین طریقہ ہے جس سے نفس و روح کو بھی راحت ملتی ہے اور جسم کو بھی۔

تکامل ذات

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ روحانیت کا فروغ اور تکامل (یعنی درجۂ کمال تک پہنچنا) اسی پر مبنی ہے کہ اللہ عزّوجلّ نے جو فرائض ہم پر عائد کیے ہیں ان کو ادا کیا جائے اور اس کے لیے جسمانی صحت کا قائم رہنا نہایت ضروری ہے تاکہ اللہ کے امر و نہی پر عمل ممکن ہو سکے۔ پس استغناءِ ذاتی مادیت کے فروغ سے چشم پوشی کرکے نہیں حاصل ہو سکتا۔ کیونکہ استغناءِ ذاتی درحقیقت ایک روحانی حالت اور معنوی احساس کا نام ہے۔ جو نہ صرف مادی ترقی سے حاصل ہو سکتا ہے نہ جسمانیت سے بے تعلق ہو کر۔ لہٰذا وہ لوگ جو اسے صرف مادی ذرائع سے حاصل کرنا چاہتے ہیں

وہ پیاس کی حالت میں سراب کی طرف دوڑنے کی مانند عمل کرتے ہیں کیونکہ صرف مادیت پر اعتماد بہت جلد زائل ہو جاتا ہے اور یاس و ناکامی کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ امر معمولی غور و فکر سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

پس مادی ذرائع کو جمع کرنے اور جسمانی تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ روحانی پہلو کا فروغ انسان کو صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہیں دیتا اور اس کے تمام جسمانی و روحانی پہلوؤں کو ترقی و کمال کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے کیونکہ مادی لذتیں چاہے کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں وہ بالآخر فنا ہو جاتی ہیں جبکہ حقیقی "تکامل ذات" خالقِ کائنات کے قرب اور اس کے نور سے منور ہونے میں مضمر ہے۔

تکامل ذات کی مثال

اس امر کی بہترین مثال حضرت سلیمان ابن داؤد علیہما السلام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے درجۂ نبوت کے ساتھ ساتھ ایسا ملکِ عظیم بھی عطا فرمایا جو ان سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام "نہج البلاغہ" میں فرماتے ہیں: "اگر کوئی شخص دنیا میں دائمی بقا کا زینہ اور دفعِ موت کا راستہ پا سکتا تھا تو وہ حضرت سلیمانؑ ابن داؤدؑ ہو سکتے تھے جن کے لیے اللہ نے نبوت اور قربِ عظیم کے ساتھ ساتھ جنّ و انس پر حکومت کو بھی جمع کر دیا تھا۔ مگر جب وہ اپنا رزق پورا کر چکے اور ان کی مدّتِ حیات ختم ہو گئی تو کمانِ فنا نے ان کو پیکانِ قضا سے مارا اور محلات اور دیار ان سے خالی ہو گئے اور دوسروں کو وراثت میں مل گئے۔"[1]

---

[1] (حاشیہ صفحہ ۶۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

(حاشیہ) بحارالانوار جلد ۱۴ صفحہ ۸۰ پر محمد ابن کعب سے روایت ہے کہ "ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت سلیمانؑ ابن داؤدؑ کا لشکر سو فرسخ میں پھیلا ہوتا تھا۔ پچیس فرسخ انسانوں کے لیے تھے، پچیس جنوں کے لیے۔ پچیس وحشی جانوروں کے لیے اور پچیس پرندوں کے لیے اور ان کے محل میں جو لکڑی اور شیشے سے بنا ہوا تھا، ایک ہزار کمرے تھے۔ جن میں تین سو مہریافتہ بیویاں رہتی تھیں اور سات سو باندیاں۔ وہ تیز ہوا کو حکم دیتے تھے تو وہ ان کے محل کو اٹھا لیتی تھی۔ پھر نرم رو ہوا اسے لیکر چلتی تھی۔ ایک موقع پر وہ زمین اور آسمان کے درمیان دوشِ ہوا پر چل رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف پیغام بھیجا کہ "میں نے تمہاری حکومت میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ اب مخلوقات میں سے جو بھی کوئی کلام کریگا، ہوا اس کی خبر تمہیں دے دے گی۔"

اور مقاتل کا قول ہے کہ "شیاطین نے حضرت سلیمانؑ کے لیے ایک فرسخ لمبا ایسا فرش بُنا تھا کہ جس میں ریشم کے تاروں کے ساتھ سونا ملا ہوا تھا۔ اس فرش کے بیچ میں سونے کا ایک میز رکھا جاتا تھا جس پر حضرت سلیمانؑ بیٹھتے تھے اور ان کے ارد گرد سونے و چاندی کی تین ہزار کرسیاں ہوتی تھیں۔ سونے کی کرسیوں پر صلحاء بیٹھتے تھے اور چاندی کی کرسیوں پر علماء بیٹھتے تھے۔ پرندے ان پر اپنے پروں سے سایہ فگن ہوتے تھے۔ تاکہ اُن پر دھوپ نہ پڑے اور ہوا اس پورے فرش کو اپنے دوش پر اٹھا کے چلتی تھی۔ صبح سے شام تک ایک ماہ کی مسافت طے ہوتی اور شام سے صبح تک ایک ماہ کی۔

پروردگار عالم اپنی کتاب قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"اور ہم نے سلیمانؑ کے لیے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اُن کے امر سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت

دی تھی اور ہم ہر چیز کے جاننے والے ہیں اور شیطانوں میں سے کچھ وہ تھے جو ان کے لیے سمندروں میں غوطے لگاتے تھے اور دوسرے کام بھی کرتے تھے اور ہم ہی ان سب کی حفاظت کرنے والے تھے۔" (سورہ انبیاءؑ - آیت ۸۱-۸۲)۔

نیز ارشاد ہوا:

"اور ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو کچھ علم دیا تو ان دونوں نے کہا سب حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی اور سلیمانؑ، داؤدؑ کے وارث ہوئے اور انھوں نے کہا: اے لوگو! ہمیں پرندوں کی گفتگو کا علم دیا گیا ہے اور ہمیں ہر چیز عطا کی گئی ہے۔ یقیناً یہی کھلا ہوا فضلِ خدا ہے۔" (سورہ نمل - آیت ۱۵-۱۶)

اور فرمایا:

"اور (ہم نے مسخر کر دیا) سلیمانؑ کے لیے ہوا کو جس کی صبح (کی چال)، ایک ماہ (کے برابر) اور شام (کی چال)، ایک ماہ (کے برابر) اور ہم نے ان کے لیے رانگے کے چشمے کو پگھلا دیا اور جنوں میں سے کچھ وہ تھے جو اُن کے سامنے کام کرتے تھے ان کے رب کے اذن سے اور ان میں سے اگر کوئی کجروی اختیار کرے تو ہم اس کو آتشِ جہنم کا عذاب چکھائیں۔ وہ (جن) ان کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ (یعنی حضرت سلیمانؑ) چاہتے تھے۔ محرابوں، تمثالوں، حوضوں جیسے بڑے پیالوں اور (بڑی بڑی) نصب شدہ دیگوں میں سے،

اے آلِ داؤدؑ! شکر گزاری کا عمل کرو۔ حالانکہ میرے بندوں میں سے بہت تھوڑے ہیں شکر ادا کرنے والے۔"

(سورۂ سبا۔ آیت ۱۲۔۱۳)

اور ارشاد ہوا:

"پس ہم نے تابع کر دیا ان کے لیے (یعنی حضرت سلیمانؑ کے لیے) ہوا کو جو اُن کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی جہاں کا وہ قصد کرتے تھے اور (ہم نے مسخر کر دیا تھا اُن کے لیے) تمام تعمیر کرنے والے اور غوطہ خور شیاطین کو، اور کچھ دوسرے (شیاطین) اُن کے سامنے آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ (اے سلیمانؑ!) یہ ہماری عطا ہے۔ چاہو تو اس کو احسان کر کے (کسی کو) دیدو اور چاہو تو اپنے پاس بغیر حساب کے رکھے رہو اور ہمارے پاس ان (سلیمانؑ) کے لیے قربِ منزلت بھی ہے اور حُسنِ انجام بھی۔"

(سورۂ ص ۔ آیات ۳۶ تا ۴۰)

حضرت سلیمانؑ کا زہد و قناعت

حضرت سلیمان علیہ السلام اس عظیم حکومت و اقتدار کے باوجود بغیر چھنے ہوئے جَو کے آٹے کی روٹی کھاتے تھے۔ مگر اپنے مہمانوں کو گیہوں کے بہترین آٹے کی روٹی کے ساتھ گوشت کھلاتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "حضرت سلیمانؑ اپنے مہمانوں کو گوشت اور میدے کی روٹیاں کھلاتے تھے۔ اپنے اہل خانہ کو بغیر چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھلاتے تھے اور خود بغیر چھنے ہوئے جَو کی روٹیوں پر

گزار کرتے تھے۔"

حضرت صادق علیہ السلام ہی فرمایا کرتے تھے: "وہ ایک تسبیح جسے اللہ قبول کرے، آلِ داوٗدؑ کو ملی ہوئی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔" ایک دوسری روایت میں امام علیہ السلام نے اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا ہے کہ "تسبیح کا ثواب باقی رہتا ہے جبکہ ملکِ سلیمان فنا ہونے والی چیز تھا۔"[1]

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا قرآن مجید میں نقل فرمائی ہے کہ "اے پروردگار! مجھے وہ ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔" تو انھوں نے وہ ملک طلب ہی کیوں کیا؟ جبکہ انہیں بارگاہِ ایزدی میں ابدیت کا وہ عظیم مرتبہ حاصل تھا کہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ خود معمولی اون کے کپڑے پہنتے تھے اور جب تاریکی چھا جاتی تھی تو اپنے ہاتھوں کو اپنی گردن سے باندھ کر رات بھر بارگاہِ خداوندی میں کھڑے روتے رہتے تھے اور اُن کی خوراک کھجور کی چٹائیوں سے حاصل ہوتی تھی جن کو وہ خود اپنے ہاتھوں سے بُنا کرتے تھے ــــــ تو اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ انھوں نے یہ ملکِ عظیم کافر بادشاہوں پر قوت و غلبہ پانے کے لیے مانگا تھا، مگر اس سوال سے پہلے ہی انھوں نے قناعت مانگ لی تھی۔[2]

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیاوی لذتوں سے پرہیز کرنا نہایت دشوار اور سخت کام ہے۔ کیونکہ دنیاوی لذتیں فوری ہوتی ہیں اور آخرت کی سعادت بعد میں ملنے والا سودا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ نقد سودے کے مقابلے میں ادھار کو ترجیح دینا دشوار ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت سلیمانؑ

---

[1] دعواتِ راوندی جلد ۴ صفحہ ۷۰ [2] بحار الانوار جلد ۴ صفحہ ۸۳

نے دعا کی: "اے پروردگار! مجھے وہ مملکت عطا کر دے جو بشریت سے بالاتر ہو تاکہ میں کامل قدرت کے باوجود لذاتِ دنیا سے اجتناب کی حالت میں باقی رہوں اور لوگوں پر یہ امر ظاہر ہو جائے کہ مالِ دنیا کا حاصل ہونا اطاعتِ الٰہی سے روکنے والا نہیں ہوتا۔"[1]

اس جواب باصواب سے یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ جو اللہ کے ایک معصوم نبی تھے، معاذ اللہ وہ بخل سے کام لیتے تھے۔ اس شبہے کا مزید جواب یوں بھی دیا جا سکتا ہے کہ ملک و اقتدار دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو ظلم و جور اور لوگوں کو مجبور کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے، جیسے فرعون اور طواغیت کی حکومت ـــــ اور دوسرا ملک و اقتدار وہ ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے بطور نمائندگی عطا ہوتا ہے۔ جیسے آلِ ابراہیمؑ حضرت طالوتؑ اور ذوالقرنین وغیرہ کی حکومتیں ـــــ پس حضرت سلیمانؑ نے یہ دعا کی تھی: "پروردگار! مجھے وہ ملک (یعنی اقتدار) عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو" تو اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ ظلم و جور سے حاصل کیا ہوا اقتدار نہ ہو تاکہ وہ ان کی نبوت کا معجزہ بھی ہو اور ان کی نمائندگی پر دلیل بھی بنے۔ لہٰذا ایسا ملک حکام ظالمین کو غلبہ و قوت اور ظلم و جور سے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کے بعد دوسرے انبیاء و اوصیا کے لیے ان جیسا اقتدار یا ان کے اقتدار سے بھی بڑا اقتدار ملنے کی نفی نہیں ہے بلکہ واقعتاً ملا بھی ہے۔ (مثلاً حضرات محمد و آلِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سارے عالمین پر اللہ نے حاکمیت و اقتدار کی دولت عطا فرمائی۔ مترجم)۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۴ صفحہ ۸۹

بہرحال ایک نبی معصوم کے بارے میں بخل جیسی گھٹیا صفت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عصمت اور بخل ایک ہی شخص میں جمع نہیں ہوسکتے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں حدیثِ معصوم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جب صبح کو برآمد ہوتے تھے تو اشراف و اغنیا کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے، یہاں تک کہ مسکینوں کے پاس پہنچتے تو ان کے درمیان بیٹھ جاتے اور فرماتے: "مسکینوں کے ساتھ ایک مسکین اور آ بیٹھا ہے۔"

(بحارالانوار جلد ۱۴ صفحہ ۸۳) حاشیہ ختم

تکاملِ حقیقی کا راز

پس معلوم ہوا کہ تکاملِ حقیقی اور مستقل استغنا ذاتی کا راز اللہ سے رابطہ قائم رکھنے اور غیر اللہ سے بے پروا ہو جانے ہی میں پوشیدہ ہے، جبکہ انسان گناہوں سے دور ہو کر لباس تقویٰ سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے: "اگر تم بغیر حمایتِ قبیلہ کے عزت چاہتے ہو تو گناہ کی ذلت سے نکل کر اطاعتِ الٰہی کی عزت میں داخل ہو جاؤ۔"

لہٰذا ایک ہی راستہ ہے اک مردِ موحّد کے لیے۔ وہ مردِ خدا پرست جو اپنے تمام حالات میں اپنے پروردگار سے رابطہ قائم رکھتا ہے۔ اطاعتِ الٰہی میں عزت کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے نفس کو امورِ مادیہ کے بارے میں غیروں کا دست نگر بن کر ذلیل نہیں کرتا نہ اللہ کے سوا اپنے کو کسی مادی، روحانی یا اعتباری معاملے میں کسی اور کا محتاج سمجھتا ہے۔ کیونکہ انسان کا جو سب سے بڑا مقصدِ حیات ہے وہ حیاتِ ابدی و بقائے سرمدی ہے۔

پانچواں مرحلہ

عالمِ برزخ

لُغت میں لفظ "برزخ" کے معنی ہیں وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان اس طرح حائل ہو کہ انھیں آپس میں ملنے سے روکے رکھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اس نے (یعنی اللہ نے) دو دریاؤں کو اس طرح جاری کیا کہ وہ آپس میں ملتے ہیں۔ مگر ان کے درمیان ایک ایسی رکاوٹ ہے جس سے وہ ایک دوسرے میں داخل نہیں ہوتے۔" (سورۂ رحمٰن۔ آیت ۱۹-۲۰)

یعنی میٹھے اور نمکین پانی مراد ہیں اور وہ رکاوٹ جو اُن دونوں کو ملنے سے روکے رکھتی ہے برزخ کہلاتی ہے۔ اصطلاح میں برزخ اس گھاٹی کو کہتے ہیں جو عالمِ دنیا اور عالمِ آخرت کے درمیان ہے۔

راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن" میں لکھا ہے کہ برزخ اس

زمانے کو کہا جاتا ہے کہ جو موت اور روزِ قیامت کے درمیان ہے۔"

محقق فیض کاشانی نے "الوافی" جلد ۳ صفحہ ۹۲ میں لکھا ہے کہ برزخ سے مراد وہ حالت ہے جو موت اور بعث کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ حالت جسم سے روح کی مفارقت کے بعد دوبارہ جسم میں لوٹنے تک کی ہوتی ہے۔ یعنی قبر کی حالت جس میں روح ایک جسم مثالی میں رہتی ہے اور انسان اپنے کو نیند کی سی حالت میں پاتا ہے۔ حدیث نبوی میں ہے کہ "نیند برادرِ موت ہے" اور قرآن میں ہے کہ "اللہ (انسانی نفسوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے) اور ان نفسوں کو بھی جو نیند کی حالت میں نہیں مرتے ــــ پس وہ نفوس جن کی موت کا وقت آچکا ہوتا ہے ان کو اللہ روک لیتا ہے اور جو نیند میں نہیں مرتے ان کو ایک مدت معینہ کے لیے جسم کی طرف بھیج دیتا ہے۔" (سورۂ زمر۔ آیت ۴۲)

جناب صدوقؒ نے اپنے سلسلہ سند کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا:

"اے فرزندانِ عبدالمطلب، یقیناً سفیر اپنے اہل سے جھوٹ نہیں بولتا۔ اس ہستی کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، جیسے تم سوتے ہو اُسی طرح مرو گے اور جیسے تم جاگتے ہو اسی طرح دوبارہ اٹھائے جاؤ گے اور موت کے بعد جنت یا جہنّم کے سوا کوئی اور گھر نہیں ہے۔"

مثالی جسم

پس برزخ کا شمار نہ دنیا میں ہے نہ آخرت میں ــــ دنیا میں اس لیے نہیں کہ وہاں کی زندگی حیات دنیوی کی طرح نہیں کیونکہ روحِ انسانی

ایک مثالی جسم میں ہوتی ہے جو ہوا کی طرح رقیق اور جسم مادی سے لطیف تر ہوتا ہے۔ جس میں نہ مادی کثافت ہوتی ہے نہ مجردات کی سی لطافت، بلکہ وہ ان دونوں کیفیتوں کے درمیان میں ہوتا ہے۔

عالمِ برزخ کو عالمِ مثالی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے عالمِ دنیا کی طرح ہوتا ہے، مادی اعتبار سے نہیں۔ اسی لحاظ سے اس کی خصوصیات عالمِ دنیا سے مختلف ہوتی ہیں۔ جہاں تک عالمِ برزخ کی وسعت کا تعلق ہے تو جیسا رحمِ مادر اور عالمِ دنیا کی وسعتوں میں فرق ہے ویسا ہی فرق عالمِ دنیا اور عالمِ برزخ کے درمیان ہے اور جس طرح رحمِ مادر میں پہنچنے والا انسان عالمِ دنیا کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اسی طرح اس دنیا کا رہنے والا عالمِ برزخ کی وسعتوں اور اس کی خصوصیات کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ علاوہ بریں چونکہ عالمِ برزخ میں روحِ انسانی ایک مثالی ڈھانچے میں ہوتی ہے لہٰذا اگر کوئی اسے دیکھے تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ وہی عالمِ دنیا میں رہنے والا شخص ہے۔ مگر درحقیقت اس کا جسم مثالی ہوا سے بھی زیادہ رقیق ولطیف ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے لیے اشیاء کا احاطہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔[1]

عالمِ برزخ میں احساسِ لذّت والم

اس مقام پر یہ اعتراض نہیں وارد ہو سکتا کہ روح تو ایک عرض ہے۔ لہٰذا وہ اس عالمِ برزخ میں لذت والم کا احساس نہیں کر سکتی۔ کیونکہ جواب یہ ہوگا کہ لذت والم کا احساس جسمِ مثالی پر واقع ہوگا روحِ مجرد پر نہیں۔[2]

---

[1] اس بنا پر وجودِ انسانی کو تین اجزاء سے مرکب تسلیم کرنا ہوگا۔ جسمِ مادی کثیف، جسمِ مثالی جو روحی اصطلاح میں "پیرسپیری" PERISPERY کہلاتا ہے اور روح۔

[2] یہ اعتراض صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جبکہ روح کو عرض تسلیم کیا جائے مگر روح کا جوہر ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ عالمِ برزخ کو عالمِ آخرت میں بھی شمار نہیں کیا جائے گا تو وہ صرف اس لیے کہ یہی عالمِ برزخ ہی انسان کی آخری منزل نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بعث و نشور (یعنی دوبارہ جسمِ اصلی میں روح کے داخل ہونے اور قبر سے اٹھنے) کی منزلیں ہیں۔ پھر اس کے بعد اعمالِ دنیوی کے حساب اور جنت یا دوزخ میں ہمیشہ کی زندگی سے بطور جزا و سزا ملنے کی منزلیں ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ عالمِ برزخ کی حیثیت عالمِ دنیا اور عالمِ آخرت کے درمیان ایک پڑاؤ کی سی ہے جہاں بدکرداروں کے لیے عذاب کی شدت نسبتاً کم ہوگی اور نیکوکاروں کے لیے نعمتوں کی لذتیں بھی کم تر ہوں گی۔ البتہ دنیا کے اعتبار سے دونوں ہی زیادہ ہوں گی۔

عالمِ برزخ کے وجود پر استدلال

عالمِ برزخ کے موجود ہونے پر آیاتِ قرآنیہ، روایات و احادیث، اجماعِ مسلمین، عقل اور خدا پرست حکماء کے اقوال سے استدلال کیا جاتا ہے۔

جہاں تک آیاتِ قرآنیہ کا تعلق ہے جو عالمِ برزخ کے وجود اور وہاں ثواب و عذاب واقع ہونے پر دلالت کرتی ہیں تو وہ بہت سی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ "اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف راضی و پسندیدہ ہو کر واپس آجا۔ پس میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔" (سورۂ فجر۔ آیات ۲۷ تا ۳۰)

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ واپس جانا موت ہی کے ذریعے مراد ہے اور موت کے بعد فوراً ہی شاملِ عبادِ صالحین ہونے کا حکم اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حالت موت کے بعد سے قیامت کے دن تک رہے گی۔

۲ـــــ "ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم لوگوں کو اس کا شعور نہیں۔"

(سورۂ بقرہ - آیت ۱۵۴)

اس آیت کریمہ کے بارے میں بحار الانوار کی روایت کے مطابق مفسر طبرسی نے فرمایا ہے کہ "اس زندگی کے بارے میں چند اقوال ہیں جن میں سے صحیح یہ ہے کہ شہداءِ راہِ خدا حقیقی طور پر زندہ ہیں قیامت تک کے لیے۔ ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور دوسرے بہت سے قدیم مفسرین کا یہی قول ہے اور شہداء کی تخصیص بطور بشارت ہے۔ اگرچہ ایک طرح دوسرے مومنین بھی زندہ ہیں۔ اس کے بعد ان کے رزق پانے کا بھی ذکر ہے جیسا کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اور تم ہرگز ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ تو زندہ ہیں اور اپنے رب کی بارگاہ سے رزق پاتے ہیں۔" (سورۂ آل عمران - آیت ۱۶۹)

فخر الدین رازی نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ اکثر مفسرین کی رائے یہی ہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ کے اطاعت گزاروں کو ان کی قبر میں بھی ثواب ملتا ہے۔ رازی لکھتے ہیں کہ اس حقیقت پر کئی آیتیں دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً وہ آیتیں جو عذاب قبر پہ دلالت کرتی ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ان لوگوں نے کہا: ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا۔"

(سورۂ مومن - آیت ۱۱)

اور دو مرتبہ موت متحقق نہیں ہو سکتی، جب تک حیاتِ قبر نہ تسلیم کی جائے۔

شیخ طوسیؒ نے تفسیر "التبیان" میں علامہ سدی کا یہ قول نقل کیا ہے:

"دوسری موت عالم برزخ میں واقع ہوتی ہے، جبکہ قیامت سے پہلے بندے کو اس سے باز پرس کرنے کے لیے زندہ کیا جاتا ہے۔"

پھر شیخ طوسیؒ کہتے ہیں: "اس آیت کریمہ سے علامہ سدی کے قول کے علاوہ رجعت بھی مراد لی جا سکتی ہے اور یقینی طور پر یہاں کوئی ایک قول مراد نہیں لیا جا سکتا۔"

انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ابن عباس، عبداللہ اور ضحاک کا کہنا ہے کہ: "یہ بھی اس آیت کی طرح ہے "کیسے تم خدا کا انکار کر سکتے ہو؟ تم ماؤں کے پیٹوں میں بے جان تھے تو اسی نے تم کو زندہ کیا۔ وہی تم کو موت دے گا اور وہی تم کو زندہ کرے گا اور وہی تم کو دوبارہ زندہ کرے گا۔"

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۸)

انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس آیت مبارکہ میں کفار کو خبردار کرنا اور ان کے کفر کے خلاف حجت قائم کرنا مقصود ہے یعنی کس طرح وہ لوگ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا انکار کر رہے ہیں، حالانکہ وہ رحمِ مادر میں آنے سے پہلے پشتِ پدر میں نطفہ کی صورت میں مردہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا یعنی ان کو دنیا میں زندگی بخشی۔ وہ ان کو قبر میں زندہ کرتا ہے تاکہ ان سے باز پرس کی جائے۔ نیز اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن دوبارہ اُٹھا کھڑا کریں گے۔[1]

---

[1] تفسیر تبیان جلد اول صفحہ ۱۲۳

سورۂ مومن کی گیارھویں آیت کہ "تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا" کے متعلق تفسیر مجمع البیان میں تین اقوال آئے ہیں۔ ان میں سے پہلے اور تیسرے قول کے مطابق اس آیت شریفہ میں زندہ ہونے سے مراد عالم برزخ میں زندہ ہونا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ قوم نوحؑ کے بارے میں فرماتا ہے:

"وہ ڈبو دیے گئے اور آگ میں ڈال دیے گئے"

(سورۂ نوحؑ۔ آیت ۲۵)

یہاں ان کے فوراً ہی آگ میں ڈالے جانے کا ذکر ہے۔[۱]

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وہ لوگ ہر صبح و شام آگ میں ڈالے جاتے ہیں اور قیامت کے دن اللہ فرمائے گا: اے آلِ فرعون سخت ترین عذاب میں داخل ہو جاؤ" [۲] (سورۂ مومن۔ آیت ۴۶)

ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ گنہگاروں پر یوم قیامت سے پہلے بھی عذاب ہوگا۔ لہٰذا عالمِ برزخ کا وجود ضروری ہے اور جب قیامت سے پہلے عذاب ہونا ثابت ہوا تو اطاعت گزاروں کو ثواب ملنا بھی ثابت ہے کیونکہ

۱۔ میں کہتا ہوں کہ آیت کریمہ میں فَاُدْخِلُوْا پر جو حرفِ فا ہے وہ اُن کے فوراً دخولِ نار پر دلالت کرتا ہے لہٰذا وہ آتشِ برزخ ہے۔ ورنہ اگر آتشِ جہنم مراد ہوتی تو یہاں حرف فا کی بجائے ثُمَّ استعمال ہوتا۔ (مصنف)

۲۔ اس آیت میں واؤ عطف اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ہر صبح و شام جس آگ میں ڈالے جاتے ہیں وہ قیامت کے بعد والے عذاب سے مختلف ہے۔ (مصنف)

عذاب و ثواب خدا کی طرف سے دونوں ہی حق ہیں اور یہ دونوں قبر میں واقع ہوں گے یعنی عالم برزخ میں۔ چنانچہ اہل اطاعت کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اور وہ لوگ خوش ہوتے ہیں ان لوگوں سے جو ابھی ان سے نہیں ملے۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۷۰)

یہ آیت دلیل ہے عالم برزخ کی زندگی پر۔

(صاحب بحار الانوار کا کلام یہاں ختم ہوا)

روایات واحادیث سے استدلال

جہاں تک روایات واحادیث کا تعلق ہے تو صاحب بحار الانوار فخر الدین رازی کے حوالے سے یہ حدیث پیغمبر بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔" رازی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ثواب و عذاب کے بارے میں اخبار و احادیث متواتر ہیں۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نمازوں کے بعد دعا کیا کرتے تھے: "اے اللہ! میں عذاب قبر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

رازی نے آخر میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ لوگ شہداء کی قبروں کی زیارت و تعظیم بھی کرتے ہیں جو وجود حیات برزخ کی ایک دلیل ہے۔

(علامہ مجلسیؒ صاحب بحار الانوار کا کلام بحوالہ رازی یہاں ختم ہوا)

بحار الانوار جلد ۶ میں یہ احادیث بھی مروی ہیں:

۱۔ روایت کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ غزوۂ بدر میں مشرکین قریش کے مقتولین کا نام لے کر ان کو پکارتے تھے اور فرماتے تھے: "کیا تم نے اپنے پروردگار

کے وعدوں کو بطور حق پا لیا؟"
لوگوں نے کہا: "یا رسول اللہؐ! یہ تو مردہ ہیں، آپ ان کو کیسے پکارتے ہیں؟"
آنحضرتؐ نے فرمایا: "یہ تم لوگوں سے زیادہ سنتے ہیں۔" (صفحہ ۲۰۰)
۲۔ آنحضرتؐ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا: "انبیاءؑ اللہ مرتے نہیں بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔" (صفحہ ۲۰۷)
۳۔ اور آنحضرتؐ ہی سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے لیے جب وہ غزوۂ موتہ میں شہید ہو گئے تو فرمایا: "میں نے ان کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کو دو پر دیے گئے ہیں جن سے وہ ملائکہ کے ساتھ پرواز کرتے ہیں۔" (صفحہ ۲۱۴)
۴۔ عذابِ قبر کی تاکید کے بارے میں وہ حدیث بھی ہے جو "الکافی" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "لیکن میں تم لوگوں کے بارے میں عالمِ برزخ کا خوف کرتا ہوں۔" پوچھا گیا: "برزخ کیا ہے؟" آپ نے فرمایا: "وہ قبر ہے، موت سے لے کر قیامت تک!" آپ ہی نے فرمایا ہے: "خدا کی قسم میں تم لوگوں کے بارے میں صرف عالمِ برزخ کا خوف کرتا ہوں۔ پھر جب معاملہ ہم تک پہنچ جائے گا تو ہم (تمہاری مدد کے لیے) تمہارے لیے اولیٰ ہوں گے۔" [1]
عمرو ابن یزید سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے حضرت ابو عبداللہ

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۱۴

امام صادق علیہ السلام سے کہا: "میں نے جناب کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہمارے تمام شیعہ بہر حال جنت میں ہوں گے"؛ تو امامؑ نے فرمایا: "تم نے سچ کہا، بخدا وہ سب جنت میں ہوں گے"؛ انھوں نے کہا: "میں آپ پر فدا ہو جاؤں، کچھ گناہ تو کبیرہ بھی ہوتے ہیں"؛ امامؑ نے فرمایا: جہاں تک یوم قیامت کا تعلق ہے تو تم سب کے سب جنت میں جاؤ گے نبی مطاع یا وصی نبی کی شفاعت سے —— لیکن خدا کی قسم! میں تم لوگوں کے بارے میں برزخ کا خوف کرتا ہوں"۔ انھوں نے کہا: "برزخ کیا ہے؟" امامؑ نے فرمایا: "وہ قبر ہے موت سے لیکر قیامت تک!" [1]

اور امام صادق علیہ السلام پروردگار عالم کے اس قول کے بارے میں کہ "اور ان کے بعد ایک برزخ اس دن تک کے لیے جب کہ وہ پھر اٹھائے جائیں گے"؛ فرمایا ہے: "برزخ سے مراد قبر ہے جہاں دنیا اور آخرت کے درمیان ثواب و عقاب ملے گا"۔ [2]

واضح ہو کہ آیاتِ کریمہ، احادیثِ کثیرۂ متواترہ اور براہین قاطعہ سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ موت کے بعد انسانی روح باقی رہتی ہے۔ اگر وہ پورا کافر رہا ہو تو مبتلائے عذاب ہو کر اور اگر پورا مومن رہا ہو تو نعمتوں سے بہرہ یاب ہو کر لیکن اگر وہ ضعیف العقل رہا ہو تو اسے چھوڑ رکھا جائے گا اور یہ سب کچھ جسم مثالی میں ہوگا"۔ [3]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۷۱ [2] بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۱۸

[3] بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۷۰۔ سید جزائری نے انوار نعمانیہ (صفحہ ۵۷۴) میں لکھا ہے: "وہ لوگ جن کے بارے میں اخبار و احادیث میں وارد ہوا ہے کہ

دلیل اجماع

اجماع کے متعلق علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "اور جان لو کہ عالم برزخ کا ثواب وعقاب وہ ہے جس پر ابتدا سے اب تک امت اسلامیہ کا اتفاق ہے اور اکثر اہل مذاہب بھی اس کے قائل ہیں۔ مسلمانوں میں سے شاذو نادر کے سوا کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے۔ پس ان کے خلاف سابق ولاحق کا اجماع ہے اور عامہ وخاصہ دونوں کے یہاں اس مضمون کی احادیث متواتر وارد ہوئی ہیں۔" (بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۷۱)

عالم برزخ میں انہیں چھوڑے رکھا جائے گا اور قیامت کے دن ان کے لیے آگ روشن کی جائے گی اور ان سے کہا جائے گا: "اس میں داخل ہو جاؤ۔" تو یہ نا سمجھ اور مجنوں لوگ ہوں گے۔ وہ لوگ ہوں گے جو زمانۂ فترت انبیاء میں پیدا ہوئے اور قاصر العقل بوڑھے، بوڑھیاں اور ان کے مثل ہونگے جنہوں نے نہ ایمان کو سمجھا نہ کفر کو۔ پس وہ اپنی قبروں میں اپنی حالت پر رہیں گے یہاں تک کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ ان کو قوت ادراک عطا فرمائے گا اور پھر مذکورہ طریقے سے ان کی آزمائش ہوگی۔ (انتہیٰ)

نیز وہ لوگ جنہوں نے ثواب وعذاب قبر سے انکار کیا ہے ان میں ضرار ابن عمرو اور معتزلہ میں سے کچھ لوگ شامل ہیں۔ ۱۹۶۰ عیسوی کے لگ بھگ ملحدوں کی ایک جماعت شیراز میں ظاہر ہوئی جن کا عالم عذاب قبر سے انکار کرتا اور لوگوں کو یہ کہہ کر بیوقوف بناتا تھا کہ میت کے منہ میں کپڑا رکھ کر دفن کرو اور پھر دوسرے دن قبر کھود کر دیکھو تو اس کو اسی حالت میں پاؤ گے۔ پس اگر سوال وحساب ہوتا تو اس کے منہ سے کپڑا گر جاتا۔ پھر یہ کہ

حکماءِ خداشناس کے اقوال

جہاں تک حکماءِ خداشناس کا تعلق ہے تو ان میں ایک گروہ یعنی افلاطون اور ان کی پیروی کرنے والوں کا یہ نظریہ ہے کہ کائنات میں عالمِ حسّی کے علاوہ ایک عالمِ مقداری (یعنی مثالی) بھی موجود ہے جو عالمِ مادیات اور عالمِ مجردات کے درمیان واقع ہے۔ نہ اس میں مادیات جیسی کثافت ہے، نہ مجردات جیسی لطافت اور اس میں اجسام و اعراض کے لیے حرکت، سکون، آواز، ذائقہ اور خوشبو وغیرہ کے احساسات سب کچھ پائے جاتے ہیں قائم بالذات ہو کر مگر کسی مادے میں معلق ہوئے بغیر۔ یہ نہایت وسیع عالم ہے اور اس میں رہنے والے لطافت و کثافت اور حسن و قبح صورت کے لحاظ سے مختلف درجات میں ہوتے ہیں اور ان کے مثالی اجسام میں تمام حواسِ ظاہری و باطنی موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ ہر قسم کے جسمانی و روحانی آلام سے اذیت بھی اٹھاتے ہیں اور نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ [1]

ہم عذابِ قبر کی شدت و صعوبت کے باوجود اس کی آواز نہیں سنتے"۔

(انوار نعمانیہ صفحہ ۴۵۸ - چاپ سنگی)

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ ملحد عقل و تدبر سے کام لیتا اور تقاضائے فطرت پر غور کرتا تو ایسی سطحی بات کہنے سے گریز کرتا اور خدا پر ایمان لاتے ہوئے یہ جان لیتا کہ یہ آنکھ کان تو عالمِ مادی کے اعضاء ہیں اور مادے سے بنے ہیں۔ یہ امورِ ملکوتی کو دیکھنے اور سننے سے قاصر ہیں۔ پس عالمِ برزخ کی باتوں کو دیکھنے اور سننے کے لیے مادی حواس ناکافی ہیں۔ (مصنف)

[1] الانوار النعمانیہ صفحہ ۴۶۰

ہمارے شیخ بہائی اعلیٰ اللہ مقامہ فرماتے ہیں کہ ان امور پر اگرچہ عقلی دلیلیں نہیں قائم کی جاسکتیں، تاہم نقلی دلائل (یعنی قرآن و احادیث وغیرہ) سے یہ ثابت ہیں اور خداشناس لوگوں نے اپنے مجاہدات اور مکاشفات سے بھی ان کی تائید و تحقیق کی ہے اور ظاہر ہے کہ روحانی تحقیق کرنے والے مادی محققین سے قدر و منزلت کے اعتبار سے بلند تر ہیں۔ پس جس طرح تم ان مادی تحقیقات کرنے والوں کے نظریات کو ہیئت فلکی وغیرہ کے بارے میں تسلیم کرتے ہو، اسی طرح تمہیں روحانی مجاہدہ و مکاشفہ کرنے والوں کی باتیں ملکوتی و مقدس عوالم کے بارے میں تسلیم کرنی چاہئیں[1] اور علامہ حلی اعلیٰ اللہ مقامہ نے "شرح حکمۃ الاشراق" میں عالم برزخ کے وجود کا قول انبیاءؑ اولیا اور خداشناس حکماء کی طرف منسوب کیا ہے[2]

دلیل عقلی

پوشیدہ نہ رہے کہ قادرِ مطلق نے انسان کی خلقت گیلی مٹی سے کی۔ پھر اسے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کی صورت میں پورا بشر بن گیا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جسم انسانی نطفہ، منی سے پیدا ہوا، نطفہ خون سے، خون غذاؤں سے اور غذائیں مٹی، ہوا، رطوبت اور حرارت وغیرہ سے وجود میں آئیں۔

پھر جب نطفہ "قرار مکین" یعنی مستحکم مقام پر ٹھہر گیا تو خالق کل نے اسے علقہ بنا دیا۔ یعنی اس کو منوی صفات سے جمے ہوئے خون میں بدل دیا۔ پھر اسے مضغہ یعنی گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر اس میں ہڈیاں پیدا کر دیں اور

لہ و لہ الانوار النعمانیہ صفحہ ۳۶۰

پھر ہڈیوں کو گوشت و پوست کا لباس پہنا دیا۔

ان تمام چھ مرتبوں کے تغیرات کے بعد اسے ایک نئی خلقت عطا فرمائی یعنی روح پھونک کر اسے جیتا جاگتا انسان بنا دیا۔ جیسا کہ پروردگار نے فرمایا ہے:

"پھر ہم نے اسے ایک اور خلقت دی۔ پس برکت والا ہے اللہ جو بہترین خالق ہے۔"

یعنی ایک ایسی خلقت عطا کی جو پہلے سے مختلف تھی اور اس کے بعد وہ جسمانی و روحانی حیثیت سے روئے زمین پر بھرپور زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گیا۔

یہیں سے اس خالقِ حقیقی کی ایک ایسی عجیب و غریب صناعی و حکمت ظاہر ہوتی ہے جو شرح و بیان کے احاطے میں نہیں آسکتی[1] یہاں خلقت کے ابتدائی چھ مرحلوں اور خلقتِ روح کے بیان میں جو لفظ "ثُمَّ" یعنی پھر استعمال ہوا ہے اس سے ابتدائی مراحل اور خلقتِ روح کے درمیان جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ روح ہی وہ ہے جو انسان کو ادراک کے قابل بناتی ہے اور جسمِ مادی سے مختلف ہے۔

یہ روح وہ علوی العنصر اور قدسی الجوہر وجودی چیز ہے جو جسم میں اسی طرح رواں دواں رہتی ہے جیسے ہوا میں روشنی اور کوئلے میں آگ اور اسی سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ روح جسم مادی کی قسم میں سے نہیں ہے۔

اسی حقیقت سے اس راز کا انکشاف ہوتا ہے جو پروردگار عالم

---

[1] کتاب "توحید المفضل" کا مطالعہ کیجیے تو بہت سے عجائباتِ صنعت و خلقتِ باری کا علم ہوگا۔

کے اس قول میں کہ جو ذکر مراتب خلقت کے بعد واقع ہوتا ہے پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "پس برکت والا ہے وہ اللہ جو سب سے بہتر خالق ہے۔" اس راز کی توضیح یہ ہے کہ پروردگارِ عالم نے روح اور بدن کو جو کہ ایک دوسرے سے اپنی حقیقت میں متفاوت ہیں، ان کے تفاوت کے باوجود جمع کر دیا ہے اور انسان کی خلقت میں عجیب عجیب کمالات صنعت کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ پس وہ یقیناً احسن الخالقین ہے۔ حالانکہ پروردگار نے خلقتِ سماوات وارض کا ذکر کرنے کے بعد بھی یہ نہیں فرمایا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مذکورہ مراتب خلقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے عالمِ برزخ کے وجود سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں عالمِ خواب کو بھی ذہن میں رکھیے جو کہ زندگی و موت کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتا ہے وہ ہمارے لیے عالمِ ارواح کی مثال پیش کرتا ہے کیونکہ خواب کی حالت میں روح کو خوشی و غم اور دوسرے تاثرات کا احساس ہوتا ہے۔ وہ گفتگو کرتی ہے اور مختلف قسم کی حرکتیں اس سے صادر ہوتی ہیں، حالانکہ نہ اس کی زبان ہلتی ہے اور نہ کسی عضوِ بدن کو حرکت ہوتی ہے۔[1]

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی رحمۃ اللہ نے "الکافی" میں حسن ابن عبدالرحمان سے روایت کی ہے۔ انھوں نے حضرت ابوالحسن علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ امام ؑ نے فرمایا: "پہلے کے لوگوں میں خواب کی کیفیت نہیں ہوتی تھی۔ یہ بعد میں پیدا ہوئی۔" حسن ابن عبدالرحمٰن کہتے ہیں: "میں نے پوچھا: اس کا کیا سبب ہوا؟" آپ نے فرمایا: "اللہ نے اس زمانے کے لوگوں کی طرف ایک رسول بھیجا اور اس نے ان لوگوں کو اللہ کی اطاعت و عبادت کی طرف

مزید برین وہ مسلمان جو توحید، نبوت اور معاد یعنی اصول ثلاثہ کا علم و معرفت کے ساتھ عقیدہ رکھتا ہے اس پر واجب ہوتا ہے بحکم عقل کہ وہ ان امور کو بھی تسلیم کرے جو آیات وسنتِ متواترہ یعنی اقوال معصوم سے ثابت ہوتے ہیں، ورنہ مذکورہ بنیادی اصول کے بارے میں اس کا عقیدہ کامل نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے مرنے کے بعد اس کی بوسیدہ ہڈیوں میں پھر سے جان ڈال دے گا کیونکہ ایک بات

بلایا۔" ان لوگوں نے کہا: " اگر ہم ایسا کریں تو ہمیں کیا ملے گا کیونکہ آپ کے پاس نہ تو ہم سے زیادہ مال ہے، نہ آپ کی ہم سے زیادہ قبیلے میں عزت ہے۔" رسولؐ نے جواب دیا: " اگر تم لوگ میری اطاعت کرو تو اللہ تم کو جنت میں داخل کرے گا اور اگر نافرمانی کرو گے تو وہ تمہیں جہنم میں ڈال دے گا۔" ان لوگوں نے کہا: " یہ جنت و جہنم کیا ہے؟ " اللہ کے رسولؐ نے ان دونوں چیزوں کا وصف بیان کیا۔ ان لوگوں نے کہا: " ہم وہاں کب جائیں گے؟ " رسولؐ نے کہا: " جب تم مرجاؤ گے۔" انھوں نے کہا: " ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب لوگ مرجاتے ہیں تو گل سڑ کر راکھ ہو جاتے ہیں۔" اس کے بعد ان کی طرف سے تکذیب و توہین اور بھی بڑھ گئی۔ پس اللہ عز و جل نے ان میں خواب دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ پھر لوگوں نے جو کچھ خواب میں دیکھا اسے آکر اللہ کے رسولؐ سے بیان کیا۔ رسولؐ نے کہا: " اللہ نے اس کے ذریعے تم پر اپنی حجت تمام کی ہے۔ تمہارے مرنے کے بعد تمہاری روحیں اسی طرح ہوں گی خواہ تمہارے بدن گل سڑ جائیں۔ مگر روحیں عذاب و ثواب محسوس کریں گی۔ دوبارہ جسموں میں اٹھنے سے پہلے تک۔" (بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۴۳)۔

کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے نتیجے میں جو بات مترتب ہو اسے بھی تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حکمار کا قول ہے کہ "جو عجیب بات سنو اسے امکان کے دائرے میں تسلیم کرلو۔ جب تک یقینی دلیل سے اس کی نفی نہ ہو جائے یعنی جس چیز کا وجود و عدم دونوں ممکن ہوں، اسکے وجود سے انکار نہ کرو بلکہ اسے ممکن سمجھو۔

پس ہر وہ چیز جو دلیل قطعی سے ناممکن نہ قرار پائے وہ بحدِ امکان واقع ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کے وجود پر سچے شواہد بھی موجود ہوں اور مخبرِ صادق نے اس کے بارے میں قطعی سند کے ساتھ اپنے علمِ لدنی سے خبر بھی دی ہو تو حکم عقل کے مطابق اس کا قبول کرنا ضروری ہے اور ایسی صورت میں صرف اس کا امکان ہی نہیں بلکہ اس کے واقعی وجود کو تسلیم کرنا ہوگا اور کسی عقلمند کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔

مومن کے لیے روزِ حشر سے پہلے کی سزا

واضح رہے کہ کبھی کوئی مردِ مومن اور ولاءِ آلِ رسولؐ رکھنے والا بھی بعض گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پس جب اللہ اس کے لیے نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو دنیا ہی میں اسے تعجیل کے ساتھ سزا مل جاتی ہے اور کبھی عالمِ برزخ میں سزا ملتی ہے، یہ بات احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"پروردگارِ عالم جب کسی بندۂ گناہگار کا مرتبہ بڑھانا چاہتا ہے تو اسے بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو اسے فقر و احتیاج میں مبتلا کر دیتا ہے اور اگر ایسا بھی نہ ہو تو اس پر موت کی سختی بڑھ جاتی ہے تاکہ اسکے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔"

عمرو ابن یزید کا قول ہے کہ میں نے حضرت ابو عبداللہ امام صادق علیہ السلام سے کہا: "ہمارے اصحاب میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کبائر کا ارتکاب کرتے ہیں:"

حضرت نے فرمایا: "اے عمرو! اولیاء اللہ کو بُرا نہ کہو۔ ہمارے دوستوں میں سے اگر کوئی ایسے گناہوں کا ارتکاب کر لیتا ہے جو موجب عقاب ہوں تو اللہ اس کو جسمانی مرض میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مرض کفارۂ ذنوب بن جاتا ہے۔ اگر مرض سے عافیت ہو تو اللہ اس کو مالی نقصان میں مبتلا کرتا ہے۔ اگر ایسی بلاؤں سے وہ محفوظ رہے تو اولاد کے بارے میں مبتلا ہوتا ہے اور اگر دنیاوی مصائب سے وہ محفوظ رہ جائے تو نزع کی سختی میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کی روح بدن سے نکلتی ہے تو اللہ اس سے راضی ہوتا ہے:"

سوال منکر و نکیر

مرنے والے کو قبر ہی میں ایک حساب دینا ہوتا ہے۔ دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور اصولِ دین کے بارے میں اس سے سوال کرتے ہیں۔ اس مسئلے پر شیعہ اور اصحابِ حدیث کا اجماع ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ مستحق انعام بندۂ خدا کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ جن کے نام مبشر و بشیر ہیں۔ وہ مرنے والے سے اس کے رب، اس کے نبی اور اس کے ولی کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ وہ بندۂ مومن ان کو اپنے اس صحیح عقیدے کے مطابق جواب دیتا ہے جس پر وہ دنیا میں تھا۔ سوال کا مقصد محض استحقاق نعمت ہوتا ہے جس کے بعد اسے بشارت و نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے اور وہ شخص جو مستحق عذاب ہوتا ہے اس پر دو فرشتے آتے ہیں جن کو ناکر و نکیر

کہتے ہیں اور وہ اسے عذاب کے حوالے کر جاتے ہیں۔ اس سے سوال کا مقصد اس کے استحقاقِ عذاب کو ظاہر کرنا ہوتا ہے جو اس کے بداعتقادی کے جواب سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ان فرشتوں کا سوال موت کے بعد ہی واقع ہوتا ہے، اسی انداز پر جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ یہی علماء امامیہ اور محدثین کا نظریہ ہے اور ان کے متکلمین میں سے بھی کسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے۔[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں ہے کہ "قبر میں سوال اسی میت سے کیا جائے گا جو ایمان کو پورے طور پر سمجھتا ہو یا کفر کو۔"[2]

ابوبکر حضرمی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابوجعفر باقر علیہ السلام سے پوچھا: "اللہ آپ کا بھلا کرے! قبروں میں کن لوگوں سے سوال کیا جائے گا؟" امامؑ نے فرمایا: "ان لوگوں سے جو ایمان یا کفر کو پورے طور پر سمجھتے ہوں۔" میں نے کہا: "اور باقی لوگ؟" امامؑ نے فرمایا: "ناسمجھ لوگوں سے قطع نظر کیا جائے گا۔"[3]

اس مضمون کی متعدد حدیثیں موجود ہیں اور ان سے اس حدیث کی نفی نہیں ہوتی کہ "قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔"

مُردوں کو منتقل کرنے والے فرشتے

لئالی الاخبار میں شیخ طوسی علیہ الرحمہ کی کتاب امالی کے حوالے

---

[1] دیکھیے اوائل المقالات از شیخ مفید علیہ الرحمۃ صفحہ ۴۹ مکتبہ الداوری۔ قم

[2] البحار جلد ۶ صفحہ ۲۶۰ بحوالہ کافی [3] البحار جلد ۶ صفحہ ۲۶۲ بحوالہ کافی۔

سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ اللہ کے فرشتے ایسے بھی ہیں جو مرنے والوں کو ان کی قبروں سے منتقل کر کے اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جو ان کے لیے مناسب ہوتا ہے۔[1]

اسی کتاب میں "عوالی اللئالی" کے حوالے سے سند صحیح کے ساتھ کمیل ابن زیاد نخعی سے روایت ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: "تم اپنے مُردوں کو جہاں چاہو دفن کرو۔ اگر وہ نیکوکار رہوں گے تو ملائکہ انہیں بیت اللہ اور مدینۂ رسولؐ کے قرب میں منتقل کر دیں گے اور اگر وہ فاسق و فاجر ہوں گے تو ان کو اس مقام پر پہنچا دیں گے جس کے وہ اہل ہوں گے۔"

شیخ الطائفہ (شیخ طوسی) علیہ الرحمہ نے "کشف الحق" میں اپنی سند سے ابوبصیر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: "میں نے حضرت ابوعبداللہ امام صادق علیہ السلام کے ساتھ حج کیا تو امامؑ نے مدینے میں اپنے جدِ امجد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر کی زیارت کی اور ہم نے بھی زیارت کی۔ پس میں نے کہا: "اے فرزندِ رسولؐ! یہ ملائکہ کا میت کو ایک جگہ سے

---

[1] ان حدیثوں سے اس امر کی تردید نہیں ہوتی کہ نجفِ اشرف اور دوسرے مقدس مقامات پر دفن سے عذابِ قبر میں تخفیف ہو جاتی ہے کیونکہ اگر میت کے اعمال اتنے ہی بُرے ہوئے کہ اس کے لیے وہ جگہ مناسب نہ ہوئی تو ملائکہ اسے وہاں سے منتقل کر دیں گے لیکن اگر اس حد تک بُرائی نہ ہو گی تو وہاں دفن ہونے سے عذابِ قبر میں یقیناً تخفیف ہو گی۔ (مصنف)

دوسری جگہ منتقل کرنا کیسے ہوتا ہے ؟" تو امامؑ نے فرمایا: "اے ابا محمد! اللہ نے ستر ہزار فرشتے ایسے پیدا کیے ہیں جن کو 'نقالہ' (یعنی منتقل کرنے والے) کہا جاتا ہے۔ پس یہ فرشتے زمین کے مشرق و مغرب میں پھیل جاتے ہیں اور وہ مُردوں کو ان کے مناسب مقامات پر بدلتے رہتے ہیں۔ ایک کو اٹھا کر دوسرے کو اس کی جگہ یوں رکھ دیتے ہیں کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں چلتا اور اللہ اپنے بندوں پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا۔"

ملائکہ نقالہ کا ایک قصہ

شیخ محدث علامہ محمود عراقی نے اپنی کتاب "دارالسلام" کے شروع میں مکاشفاتِ مرحوم الحاج مولانا مہدی زراقی کے ذیل میں نجف اشرف کے ایک مردِ صالح کا بیان یوں نقل کیا ہے:

نجف اشرف میں ایک مرتبہ قحط پڑا اور سخت گرانی ہو گئی۔ میں بال بچوں والا آدمی تھا اور میرے لیے زندگانی دشوار ہو گئی۔ پس ایک روز میں زیارتِ قبور کے ذریعے اپنا غم غلط کرنے کو دارالسلام کی وادی میں چلا گیا۔ وہاں میں نے حالتِ بیداری میں لوگوں کی ایک جماعت کو دیکھا جو ایک جنازے کو لیے ہوئے آئے اور وہ اس کو لے کر ایک ایسے باغ میں داخل ہو گئے جس کا حُسن بیان سے باہر ہے۔ پھر انہوں نے اسے ایک قصر میں پہنچا دیا جو ہر طرح کے ساز و سامان سے مزین تھا۔ میں بھی ان کے پیچھے اندر چلا گیا۔ پس وہاں میں نے ایک جوان شخص کو دیکھا جو شاہانہ انداز سے ایک زرد جواہر سے مزین کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب اس جوان نے مجھے دیکھا تو مجھے خود ہی سلام کیا اور میرا نام لیکر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ میں قریب پہنچا تو میری تعظیم کو اٹھے اور بڑے احترام سے انہوں

نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھالیا اور کہا: "آپ مجھے نہیں پہچانتے۔ یہ میرا ہی جنازہ تھا جسے آپ نے دیکھا تھا۔ میرا نام فلاں ہے اور میں فلاں مقام کا رہنے والا ہوں۔ یہ لوگ درحقیقت ملائکہ تعالیٰ ہیں جنہوں نے مجھے میرے شہر سے منتقل کرکے اس جنت برزخیہ میں پہنچا دیا ہے۔" پس جب میں نے یہ سنا تو میرا غم دُور ہو گیا اور مجھے سیر کرنے کا خیال آیا۔ میں اس قصر سے نکلا اور ابھی میں کچھ دُور چلا تھا کہ کچھ اور بھی قصر نظر آئے جن میں سے بعض میں مَیں نے اپنے باپ، ماں اور دیگر عزیزوں کو دیکھا۔ جنہوں نے مسرت کے ساتھ میرا استقبال کیا اور مجھ سے انھوں نے زندہ عزیزوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے شدتِ فقر و فاقہ اور بچوں کی بھوک کا ذکر کیا۔ پس میرے والد نے ایک قبے کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "وہاں چاول ہے، جتنا چاہو لے جاؤ۔" میں خوش ہو کر اس قبے میں داخل ہوا اور اپنی عبا۔ کو چاولوں سے بھر لیا۔ پھر میں نجف کی طرف چل پڑا۔ ہم ایک مدت تک ان چاولوں میں سے کھاتے رہے۔ مگر وہ کم نہیں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ میری زوجہ نے مجھے سارا واقعہ بیان کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر جب وہ چاول کے ذخیرے کے پاس گئی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

کافی میں احمد ابن عمر کی روایت ہے کہ انھوں نے امام صادقؑ سے کہا: "میرا بھائی بغداد میں رہتا ہے اور مجھے خوف ہے کہ کہیں وہ وہیں نہ مر جائے۔" امامؑ نے فرمایا: "کیا پروا! وہ جہاں چاہے مرے، مشرق و مغرب میں جہاں کہیں کوئی مومن مرتا ہے، پروردگار اسے وادی السلام میں لے آتا ہے۔" انھوں نے کہا: "وادی السلام کہاں ہے؟" امامؑ نے فرمایا: شہر کوفہ کی پشت پر واقع ہے۔ میں تو ان مومنین کو حلقہ در حلقہ باتیں

کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔" [1]

کلینی طاب ثراہ نے حبہ عرنی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

"میں امیرالمومنین علیہ السلام کے ساتھ پشتِ کوفہ کی طرف آیا تو آپ وادی السلام میں آکر یوں کھڑے ہوگئے جیسے کسی سے خطاب کر رہے ہوں۔ میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ پھر کھڑے کھڑے اکتا گیا تو بیٹھ گیا۔ آخر کار میں اٹھا اور میں نے امیرالمومنینؑ سے عرض کی: امیرالمومنینؑ! آپ بھی تھک گئے ہوں گے۔ یہ لیجیے میں اپنی چادر بچھاتا ہوں، آپ کچھ دیر آرام کر لیجیے۔" جناب امیرؑ نے فرمایا: "اے حبہ! یہ تو بس مومنین سے انس و محبت کی باتیں ہیں۔" میں نے کہا: "کیا وہ یہاں ہیں؟" آپ نے فرمایا: "ہاں! اور اگر میں تمہاری نگاہ سے پردہ ہٹا دوں تو تم بھی انہیں حلقہ در حلقہ باتیں کرتے ہوئے دیکھو گے۔" میں نے کہا: "وہ اپنے جسموں میں ہیں یا روحوں میں؟" امامؑ نے فرمایا: "روحیں ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی مومن مرتا ہے، اس کی روح سے کہا جاتا ہے: 'وادی السلام میں چلی جا۔' یہ جنت عدن کا ایک حصہ ہے۔" [2]

وادی السلام کے بقعۂ جنت ہونے کے بارے میں متواتر حدیثیں موجود ہیں اور آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ عالمِ برزخ، عالمِ دنیا سے مختلف ہے۔ لہٰذا وہاں روحیں اجسامِ مثالیہ میں رہتی ہیں اور لذت و الم سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ تاثر دنیاوی تاثر کے مقابلے میں شدید تر اور دائمی ہوتا ہے۔ مگر اس دنیا کے لوگوں کے لیے اس کا ادراک اسی طرح ناممکن ہوتا ہے

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۶۸ [2] الانوار النعمانیہ صفحہ ۳۵۹

جیسے پیٹ کے بچے کے لیے دنیا کی زندگی کا ادراک نا ممکن ہوتا ہے۔

کیا آپ نے توجہ نہیں کی اس امر کی طرف کہ صحابہ پیغمبرؐ کے پاس بیٹھے ہوتے تھے اور آنحضرتؐ کے پاس جبرئیل امین آجاتے تھے، پیغمبرؐ ان کو دیکھتے بھی تھے اور ان سے باتیں بھی کرتے تھے۔ مگر دوسرے لوگ نہ جبرئیل کو دیکھتے تھے نہ ان کی باتیں سنتے تھے؟"

عالمِ شہود میں اس کی مثال اس خوابیدہ انسان سے دی جا سکتی ہے جس کے پاس لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اور وہ خواب میں طرح طرح کی چیزیں یہاں تک کہ بعید مقامات کو دیکھتا ہے اور کبھی کبھی ان چیزوں کو دیکھ کر اس قدر خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ اس کی چیخ نکل جاتی ہے۔ پھر بھی اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ نہ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں نہ اس کی خواب والی باتوں کو سنتے ہیں۔

سید نعمت اللہ جزائری کا ارشاد

انوار نعمانیہ صفحہ ۴۵۸ میں وہ لکھتے ہیں: "ہاں قبر میں فرشتوں کا سوال، فشار قبر اور وہاں کا عذاب اسی بدن پر واقع ہوتا ہے۔ پھر جب روح اس عذاب یا ثواب سے فارغ ہوتی ہے تو وہ دوسری قسم کی شقاوت یا سعادت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حضرت رسولؐ کا فرمان ہے: "قبر یا تو باغاتِ جنت میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔" پس منزل قبر کے بعد روح ہیکل مثالی میں چلی جاتی ہے جو نہایت لطیف ہوتا ہے۔ لہٰذا عالم برزخ مجردات و مادیات کے درمیان کی ایک اور چیز ہے جس میں اللہ تعالیٰ روح کو نہایت قلیل عرصے میں بعید ترین مسافت طے کرنے کی صلاحیت دے دیتا ہے۔ اگر وہ مومن کی روح

ہوتی ہے تو وادیٔ سلام میں چلی جاتی ہے جو پشتِ کوفہ پر ایک جنتِ ارضی ہے مگر مادی نگاہوں سے نظر نہیں آتی۔ وہاں تمام مومنین کی روحیں مثالی قالب میں رہتی ہیں اور جنت خلد کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ وہاں ان کے لیے گل وگلزار، نہریں، حوریں اور شہد و شیر کی نہریں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ کھاتے پیتے بھی ہیں اور جنتی نعمتوں سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں حلقہ در حلقہ بیٹھتے بھی ہیں اور پھر باتیں بھی کرتے ہیں۔" انتہیٰ۔

فشارِ قبر

جب کسی بندۂ مومن کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو زمین کہتی ہے: "خوش آمدید آپ اپنے ہی گھر آئے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں آپ سے محبت کرتی تھی جبکہ آپ میری پشت پر چلتے تھے۔ اب آپ میرے پیٹ میں داخل ہوئے ہیں تو دیکھیں گے کہ یہ بھی کتنی خوشگوار جگہ ہے۔" پس قبر کی زمین بندۂ مومن کے لیے حدِ نظر تک کشادہ ہو جاتی ہے۔ جب کسی فاسق و فاجر شخص کو قبر میں اتارا جاتا ہے تو زمین کہتی ہے: "تیرے لیے کوئی خوش آمدید نہیں اور نہ تجھ سے میرا کوئی واسطہ ہے۔ تو جب میری پشت پر چلتا تھا، مجھے تجھ سے نفرت ہوتی تھی۔ اب جبکہ تو میرے پیٹ میں آگیا ہے تو دیکھ لے کہ میں کتنی بری جگہ ہوں۔ یہ کہہ کر قبر اس پر اتنا فشار ڈالتی ہے کہ اس کا بھیجا اس کے پیروں کے ناخنوں سے نکل آتا ہے۔ اس کے بعد اس کی طرف جہنم کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے پاس ایک بدشکل آدمی آتا ہے۔ تب وہ اس کو کہتا ہے: اے بندۂ خدا تو کون ہے؟ میں نے تجھ سے بری کوئی چیز نہیں دیکھی۔ وہ جواب دیتا ہے میں تیرا وہ برا کردار ہوں جو تو نے ظاہر کیا اور میں ہی تیری ناپاک رائے ہوں۔" (انوار نعمانیہ صفحہ ۳۰۶)

فشارِ قبر کی یہی سختی ہے کہ جس سے فاطمہ بنت اسد (والدہ امام علیؑ) کے بچاؤ کا ذمہ خود حضرت رسول اللہؐ نے لیا تھا۔ چنانچہ جب فاطمہ بنت اسد کے لیے قبر کھودی گئی تو حضورِ اکرمؐ اس میں لیٹ گئے۔ جب حضورؐ سے اس عمل کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: "ایک دفعہ جب میں نے ان معظمہ سے فشارِ قبر اور اس کی سختی کا تذکرہ کیا تو وہ بولیں: ہائے افسوس کہ اپنے ضعف کی وجہ سے مجھ میں فشارِ قبر کی شدّت کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ تب میں نے ان سے کہا تھا: فشارِ قبر سے بچاؤ کے لیے میں اللہ کے دربار میں آپ کا ضامن ہوں گا۔ اب اسی لیے میں خود ان کی قبر میں لیٹا ہوں۔"

ابوبصیر سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا "میں نے امام صادقؑ سے عرض کی: "کیا کوئی انسان اپنے آپ کو فشارِ قبر سے بچا سکتا ہے؟" امامؑ نے فرمایا: "اس کی سختی سے میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔ بہت ہی کم لوگ ہیں جو اپنے آپ کو فشارِ قبر سے بچا سکتے ہیں۔ چنانچہ جب عثمان بن عفان نے دخترِ پیغمبرؐ ـــ بی بی رقیہ کو قتل کیا تو رسول اللہؐ نے ان کی قبر پر کھڑے ہو کر آنسو بہائے اور آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا: اس پر جو گزری اس نے مجھ سے بیان کی تھی۔ پس میں نے اس پر شفقت کرتے ہوئے فشارِ قبر سے اس کے بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی ہے کہ: اے اللہ! رقیہ کو فشارِ قبر سے معاف فرما۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کو خلاصی بخش دی۔" امام صادقؑ نے یہ بھی فرمایا کہ جب رسول اللہؐ نے حضرت سعد ابن معاذ کی نمازِ جنازہ پڑھی تو اس میں ستر ہزار فرشتے بھی شامل ہوئے تھے۔ تب حضورؐ نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر فرمایا: "کیا سعد جیسے شخص پر فشارِ قبر ہو گا؟"

صحابۂ کرام نے عرض کی: "ہم لوگ سنتے آئے ہیں کہ وہ پیشاب کی نجاست سے بچتے نہیں تھے۔" حضورؐ نے فرمایا: "خدا کی پناہ! وہ تو اپنے اہل وعیال سے تند خوئی برتتے تھے۔" اس وقت سعد کی والدہ بولیں: "اے سعد! تجھ کو مبارک ہو۔" حضورؐ نے فرمایا: "اے سعد کی ماں! اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف حکم نہ لگاؤ۔"

(بحار الانوار جلد ۲۲ صفحہ ۱۶۳ - فروع کافی جلد ۳ صفحہ ۲۳۶)۔

مؤلف کہتا ہے کہ جب سعد ابن معاذ جیسے جلیل القدر صحابی کو جن کی نماز جنازہ میں ملائکہ نے شرکت کی، ان کو فشار قبر سے نجات نہیں ملی تو اور کس کو اس سے نجات مل سکتی ہے۔ (انوار نعمانیہ صفحہ ۴۰۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: "قبر میں فشار ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس سے نجات پانے والا ہوا تو سعد ابن معاذ نجات حاصل کریں گے۔"[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت رقیہ، پیغمبرؐ کی بیٹی دعائے پیغمبرؐ سے فشارِ قبر سے محفوظ رہیں۔ جس طرح آپ کی دوسری بیٹی حضرت زینب کے لیے تخفیف ہوئی دعائے رسولؐ سے۔[2]

ہم پروردگارِ عالم سے حضرات محمدؐ و آل محمد علیہم السلام کے واسطے سے فشارِ قبر سے نجات اور عفو و مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔

روایات میں ہے کہ حضرت ابو عبداللہ امام صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ "وہ شخص جس کو سولی پر چڑھا کر چھوڑ دیا جائے اس پر عذابِ قبر

---

[1] البحار جلد ۶ صفحہ ۲۶۱ [2] زینب و رقیہ وغیرہ کے دختران پیغمبرؐ ہونے میں اختلاف ہے۔ (ناشر)

کیسے نازل ہوتا ہے؟" آپ نے فرمایا: "جو ربِّ ارض ہے وہی ربِّ ہوا ہے۔ پس وہ ہوا کو حکم دیتا ہے کہ اسے اسی طرح یا اس سے زیادہ فشار دے جس طرح زمین دیتی ہے۔" (البحار جلد ۶ صفحہ ۲۶۶)

معتبر روایتوں میں ہے کہ جو بندۂ مومن شب جمعہ یا جمعہ کے دن انتقال کرے، وہ فشار قبر سے محفوظ رہتا ہے۔ (انوار نعمانیہ صفحہ ۴۵۶)

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے فرمایا: "جو بندۂ مومن جمعرات کے دن زوال آفتاب کے بعد انتقال کرے، اللہ جل شانہ، اس کو فشار قبر سے محفوظ رکھتا اور قبیلہ ربیعہ و مضر جتنے کثیر تعداد لوگوں کے حق میں اس کی شفاعت قبول فرماتا ہے۔" (انوار نعمانیہ صفحہ ۴۵۶)

قولِ حضرت مفیدؒ

جناب مفیدؒ اپنی کتاب "اوائل المقالات"[1] میں لکھتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ عالمِ برزخ میں اللہ تعالیٰ مُردوں کے لیے ویسا ہی مثالی جسم پیدا کر دیتا ہے جیسا انہیں دنیا میں ملا تھا۔ مومن کو اس جسم میں نعمتیں ملیں گی اور کافر و فاسق عذاب سے دوچار ہوں گے جبکہ ان کا مادی جسم قبر ہی میں پڑا ہوگا جسے دیکھنے والے دیکھ بھی سکیں گے اور امتدادِ زمانہ سے بوسیدہ ہو کر ریزہ ریزہ بھی ہو جائے گا۔ یہ عذاب و ثواب انہیں ان کی قبروں کے علاوہ دوسرے مقامات پر ملے گا اور ہمارے مذہب کے مطابق یہ سب کچھ نفسِ انسانی پر طاری ہوگا۔ میرے نزدیک (عالمِ برزخ میں) انسان مکلف سے مراد وہ مخلوق ہے جو قائم بنفسہٖ ہے مگر جواہر و اعراض کی صفتوں سے خارج ہے اور اس

---

[1] مقالات شیخ مفیدؒ صفحہ ۴۹۔ مکتبہ داوری ایران

کی تائید میں میرے پاس صادقین آل محمد علیہم السلام کی احادیث ہیں۔ اس نظریے کے خلاف نظریہ رکھنے والے کسی متکلم امامیہ کو میں نہیں جانتا کہ اس کا نظریہ بیان کروں۔ اسی طرح فقہائے امامیہ اور اصحاب حدیث میں بھی اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔" انتہیٰ۔

خلاصہ یہ کہ عالمِ برزخ کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ مذہب امامیہ اور دوسرے بہت سے مسلمانوں کا نظریہ ہے جیسا کہ پہلے بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔

حقیقتِ موت

موت کی حقیقت یہ ہے کہ روح و بدن کا رشتہ ٹوٹ جائے اور لوگوں نے اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ روح، جسم میں اسی طرح ہوتی ہے جیسے سفینے کا ناخدا سفینے میں۔ پس ناخدا کا سفینے سے جدا ہونا ان کے باہمی رشتے کو توڑ دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ قوت جو سفینے کو ڈوبنے سے بچانے پر قادر تھی وہ اس کے ناخدا کی قوت تھی۔ حالانکہ ناخدا کی اصلیت و حقیقت سفینے کی اصلیت و حقیقت سے مختلف ہوتی ہے اور اسے سفینے پر صرف اقتدار حاصل ہوتا ہے جو اس کے جدا ہونے سے منقطع ہو جاتا ہے۔

یہی حالت روح و بدن کی ہے کہ اگرچہ دونوں اپنی حقیقت میں الگ الگ چیزیں ہیں، تاہم روح، جسم پر اقتدار رکھتی ہے اور وہ اس کا رخ اسی طرح موڑتی رہتی ہے جیسے ناخدا سفینے کا رُخ موڑتا ہے۔ پس جب وہ جسم سے جدا ہو جاتی ہے تو جسم ایک خاموش اور بجھا ہوا مادہ باقی رہ جاتا ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ روح، جسم کے اندھیرے میں نور کی مانند ہوتی ہے اور جسم اس روشنی کے ذریعے کان سے سنتا ہے اور آنکھ سے دیکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ جسم و بدن کا ہر عضو نورانیتِ روح کی برکت سے زندہ و فعال ہوتا ہے۔ لہٰذا جب روح و جسم کا تعلق ٹوٹتا ہے تو جسم سے یہ نور زائل ہو جاتا ہے۔ پس موت کے معنی ہیں اس نور یعنی روح کو مقام بدن سے نکال کر کہیں اور پہنچا دینا اور روح کے نکل جانے سے جسم پہلے کی طرح اندھیرا رہ جاتا ہے۔

اس گفتگو سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ روح و بدن کا تعلق اس انداز پر نہیں ہے کہ گویا روح، بدن میں حلول کیے ہوئے ہے۔ یعنی روح جسم میں داخل نہیں ہوتی کیونکہ روح تو ایک مجرد (یعنی مادے سے خالی) چیز ہے اور خود کوئی جسم نہیں ہے۔ پس اس کے داخل یا خارج ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ثابت ہوا کہ روح و جسم کے درمیان محض ایک تعلق ہوتا ہے، بغیر اسکے کہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر مرکب ہوں۔ لہٰذا موت نام ہے اسی تعلق کے ٹوٹ جانے کا۔ اسی وجہ سے بعض حکمار نے روح کو جسم پر محیط لباس[1] سے تشبیہ دی ہے۔ پس جس طرح لباس نہ جسم میں داخل ہوتا ہے نہ اس میں سے خارج ہوتا

---

[1] امام زین العابدینؑ حضرت علی ابن الحسین علیہما السلام سے پوچھا گیا کہ "موت کیا ہے؟" تو آپ نے فرمایا: "مومن کے لیے تو میلے لباس کو اتار کر اور بھاری قید و بند سے آزاد ہو کر بہترین و معطر ترین کپڑوں کو پہن کر نہایت سدھائی ہوئی سواری پر سوار ہو کر مرغوب ترین منزل کی طرف روانہ ہونا ہے اور کافر کے لیے لباس فاخرہ اور پر امن مقام سے جدا ہو کر نہایت گندے اور کھردرے لباس میں بدترین وحشت ناک منزل کی طرف جانا ہے۔" معالم الزلفیٰ۔

ہے بلکہ اس پر محیط ہوتا ہے، اسی طرح روح جسم پر محیط ہوتی ہے لیکن اس میں داخل نہیں ہوتی۔ یعنی روح و جسم کے درمیان یک رنگی حقیقت بالکل نہیں ہے۔ پس برکت والا ہے وہ احسن الخالقین جس نے دو مختلف الحقیقت[1] چیزوں کو نہایت مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ کردیا۔

مذکورہ بیان سے ظاہر ہوا کہ موت کے معنی کسی لباس کو اتار دینا ہے یا کسی تعلق کا ٹوٹ جانا ہے اور روح اس کے بعد معدوم نہیں ہوتی، بلکہ وہ اللہ کے اذن سے ایک دوسرے مقام پر باقی رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ روح کا بدن سے تعلق بھی اذن الٰہی سے ہوا تھا اور دونوں کے درمیان جدائی بھی اسی کے اذن سے ہوئی۔ پھر اسی کے اذن سے روح کا تعلق ایک مثالی جسم سے ہوتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

پروردگار فرماتا ہے:

"کارساز بس خدا ہی ہے، وہی مُردوں کو زندہ کریگا اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

(سورۂ شوریٰ۔ آیت ۹)

جب یہ معلوم ہوگیا کہ روح و جسم میں محض ایک تعلق ہے۔ روح نہ جسم میں داخل ہوتی ہے نہ اس سے خارج ہوتی ہے تو یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ موت اسی تعلق کے منقطع ہوجانے کا نام ہے اور روح معدوم نہیں ہوتی

---

[1] قرآن مجید میں ہے:

"لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔" (سورۂ اسراء۔ آیت ۸۵)

بلکہ اس کا ایک تعلق اسکے مردہ جسم سے بعد موت بھی باقی رہتا ہے۔ اس مقام پر کہا جا سکتا ہے کہ رُوح کا جسم سے تعلق تین قسم کا ہوتا ہے۔ پہلا وہ جو زندگی کے دوران ہوتا ہے اور یہ قوی ترین تعلق ہے دوسرا وہ جو نیند کے وقت ہوتا ہے کیونکہ نیند[1] بھی موت ہی کی طرح ہے اور اس وقت رُوح

---

[1] امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ "موت کیا ہے ؟" آپ نے فرمایا: وہ نیند کی مانند ہے جو تمہیں ہر رات آتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس کی مدت اتنی طولانی ہوتی ہے کہ انسان یوم قیامت سے پہلے بیدار نہیں ہوتا۔ پس جو شخص خواب میں فرحت و مسّرت دیکھتا ہے وہ اس کا بھی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا اور جو غم و اندوہ دیکھتا ہے وہ اس کا صحیح اندازہ لگانے سے بھی قاصر ہوتا ہے۔ لہٰذا موت کے بعد کی فرحت و مسّرت اور غم و اندوہ کا اندازہ کیسے لگا سکتا ہے۔ یہی موت ہے اور اس کے لیے اپنے کو تیار کرو۔" امام صادقؑ سے کہا گیا: "ہمارے لیے موت کی صفت بیان کیجیے ؟" امامؑ نے فرمایا: "وہ مومن کے لیے بہترین خوشبو کی مانند ہے جس کو سونگھ کر اس کے سارے درد و الم دُور ہو جاتے ہیں اور کافر کے لیے موت سانپ اور بچھو کے ڈسنے کی طرح ہے بلکہ اس سے بھی شدید تر۔" کہا گیا کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ "موت آری یا قینچی سے کاٹنے، پتھر وں سے مارنے اور آنکھوں میں چکی کے کھونٹے کو چلانے سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔" امامؑ نے فرمایا: "ہاں کافر و فاسق کے لیے وہ ایسی ہی ہوتی ہے کیا نہیں دیکھتے تم کہ ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو یہ ساری سختیاں جھیلتے ہیں۔ مگر عذاب موت ان کے لیے دنیاوی عذاب سے نہایت سخت تر ہوتا ہے۔" کہا گیا: "پس ایسا کیوں ہے کہ بعض کافروں کو دیکھتے ہیں کہ ان پر حالت نزع بہت

کا تعلق جسم کے ساتھ کمزور قسم کا رہتا ہے اور تیسرا وہ جو مرنے کے بعد روح و جسم کے ارتباط کی شکل میں باقی رہتا ہے۔ چنانچہ احادیثِ معصوم میں وارد ہوا ہے کہ دفن کے بعد میت کی روح اپنے جسم کی زیارت کو تیسرے، پانچویں، ساتویں اور چالیسویں دن آیا کرتی ہے اور جسم کی حالت کو دیکھ کر اندوہ ناک ہوتی ہے۔ یہی روح و جسم کا تعلق ہے اور اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ روح مفارقتِ بدن کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ کوئی نعمتوں میں اور کوئی عذاب میں۔ اس سلسلے میں خواہ ہم یہ قول اختیار کریں کہ یہ ثواب و عذاب روحِ مجرد پر ہوتا ہے یا تعلقِ جسم کے ساتھ ہوتا ہے یا جسمِ مثالی میں ہوتا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

عذابِ قبر

مذکورہ گفتگو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قبر میں سوال کا مسئلہ ثابت و محقق ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے

سہل ہوتی ہے اور وہ ہنستے بولتے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بعض مومنین کا بھی یہی حال ہوتا ہے جبکہ کچھ مومنین اور کچھ کافرین سکرات موت کی اذیتیں جھیلتے ہیں۔" امامؑ نے فرمایا: "مومنین کے لیے جو راحت ہوتی ہے وہ ان کے لیے فوری ثواب کا حصہ ہوتی ہے اور جو سختی ہوتی ہے وہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے تاکہ وہ آخرت میں پاکیزہ ہو کر داخل ہوں اور مستحقِ ثواب بنیں۔ اس کے برخلاف کافرین کے لیے جو سہولت ہوتی ہے وہ ان کی کسی نیکی کا اجر ہوتا ہے تاکہ آخرت میں ان کے لیے عذاب کے سوا اور کچھ نہ ہو اور جو ان پر سختی ہوتی ہے وہ اُن کے ابدی عقاب و عذاب کی ابتدا ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ کسی پر ظلم و جور نہیں کرتا۔" (معالم الزلفیٰ)

فرمایا: "وہ میرے شیعوں میں سے نہیں ہے جو ان چیزوں کا انکار کرے: معراج، سوالِ قبر، جنت و جہنّم کا وجود اور شفاعت"۔ [1]

محقق طوسی علیہ الرحمہ اپنی کتاب "التجرید" میں فرماتے ہیں: "عذابِ قبر ثابت ہے کیونکہ وہ ممکن بھی ہے اور اس کے بارے میں احادیث متواتر بھی موجود ہیں"۔ [2]

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے فرمایا: عذابِ قبر کے بارے میں اجماع ثابت ہے۔ بلکہ یہ ضروریاتِ دین میں سے ہے اور اس کا منکر کافر ہے"۔ [3]

اسی طرح شیخ صدوق علیہ الرحمہ اور شیخ مفید علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے: "احادیثِ صحیحہ اس بارے میں وارد ہیں کہ مرنے والوں پر ان کی قبر میں فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے ان کے دین کے بارے میں سوال کرتے ہیں"۔ [4]

اور روایت کی ہے علی ابن حاتم نے، علی ابن حسین نحوی سے، انھوں نے برقی سے، انھوں نے اپنے باپ سے، انھوں نے سلیمان ابن منقل سے، انھوں نے حضرت امام موسیٰ ابن جعفر علیہما السلام سے اور امامؑ نے اپنے پدرِ گرامی سے کہ امام صادقؑ نے فرمایا: "جب مومن مرجاتا ہے تو ستر ہزار ملائکۂ رحمت اس کے جنازے کے ساتھ اس کی قبر تک جاتے ہیں جب وہ قبر میں اتارا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے منکر و نکیر آتے ہیں جو اُسے بٹھا کر پوچھتے ہیں: "تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ اور تمہارا نبی کون ہے؟" پس مردِ مومن کہتا ہے: "میرا پروردگار اللہ ہے، حضرت

---

[1] بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۱۹۷ [2,3,4] کفایۃ الموحدین جلد ۳ صفحہ ۲۸۸

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میرے نبی ہیں اور اسلام میرا دین ہے۔"

تب وہ فرشتے اس کی قبر میں حد نظر تک وسعت کر دیتے ہیں۔ اسے جنت کا کھانا دیتے ہیں اور اس پر روح و ریحان کا نزول ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: "پس اگر وہ مقربین میں سے ہوا تو اس کے لیے روح و ریحان ہے۔" یعنی اس کی قبر میں آرام، آسائش و خوشبودار پھول ہیں[1] اور "جنتِ نعیم ہے آخرت میں!"

پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: "اور جب کوئی کافر مرجاتا ہے تو اس کے جنازے کے ساتھ ستر ہزار ملائکہ عذاب یعنی زبانیہ اس کی قبر تک جاتے ہیں اور وہ جنازہ اٹھانے والوں سے ایسی آوازیں کہتا جاتا ہے، جسے جن و انس کے سوا ہر چیز سنتی ہے: "کاش مجھے پلٹا دیا جاتا تو میں مومن ہو جاتا۔ مجھے واپس لے چلو کہ میں عملِ صالح کرسکوں" مگر ملائکہ عذاب، زبانیہ کہتے ہیں: "ہرگز نہیں، یہ تو تیری صرف زبانی بات ہے۔" دوسری طرف سے ایک فرشتہ آواز دیتا ہے: "اگر اسے لوٹا دیا جائے تو یہ پھر بھی وہی کرے گا جس سے اس کو منع کیا گیا تھا۔" پھر جب وہ قبر میں اتار دیا جاتا ہے تو منکر و نکیر نہایت ہیبت ناک شکل میں اس کے پاس آتے ہیں اور پوچھتے ہیں: "تیرا پروردگار کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟" اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے اور وہ کوئی جواب نہیں دے پاتا۔ پس وہ فرشتے اسے عذاب کی وہ مار مارتے ہیں جس سے ہر چیز ڈر جائے۔ پھر وہ اپنا سوال دہراتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: "میں نہیں جانتا۔" فرشتے کہتے ہیں: نہ تو نے

---

[1] سورۂ واقعہ۔ آیت ۸۸-۸۹

جانا، نہ ہدایت پائی نہ کامیاب ہوا۔" اس کے بعد وہ اس کی قبر میں جہنم کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اللہ عزوجل نے اس کے بارے میں فرمایا:

"اور اگر وہ تکذیب کرنے والے گمراہوں میں سے ہوا تو اس کے لیے کھولتا ہوا پانی ہے۔"

یعنی "قبر میں نیز جہنم میں داخل ہونا ہے۔ یعنی آخرت میں۔"

(سورۂ واقعہ۔ آیات ۹۲ تا ۹۴) اور (بحارالانوار جلد ۶ صفحہ ۲۲۲)

تخفیفِ عذابِ قبر

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: "یقیناً قبر منازلِ آخرت میں سے پہلی منزل ہے۔ پس اگر کوئی وہاں نجات پا گیا تو بعد کی منزلیں اس کے لیے آسان ہیں اور اگر وہاں نجات نہ ملی تو اس کے بعد اس کے لیے جو کچھ ہوگا وہ اس سے کمتر نہیں ہوگا۔"

پس چونکہ قبر منازلِ آخرت میں سے پہلی منزل ہے، لہٰذا انسان کو اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہاں وہ عذاب سے نجات پا سکے۔ منزلِ قبر کی آسانی کے لیے ہم چند چیزیں لکھتے ہیں اور یہ دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو ہر شخص کے اپنے عمل[1] سے متعلق ہے اور دوسری وہ جو اس کی وفات کے بعد اس کے وارثوں وغیرہ کو اس کے لیے کرنا چاہیے۔

جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے تو اس میں سب سے اہم نمازوں کو

---

[1] امیرالمومنینؑ اپنے خطبے میں فرماتے ہیں: "موت کی بیہوشی سے پہلے ہی اس کی طرف سبقت کرو اور اس کے آنے سے پہلے ہی اس کے لیے تیاری کر لو اور ذخیرہ جمع کر لو۔" (بحارالانوار جلد ۶ صفحہ ۲۴۴)

وقت پر ادا کرنا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: "جو شخص صحیح طور پر رکوع کرتا ہے، اس پر وحشتِ قبر طاری نہیں ہوگی"۔

(بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۴۴)

بعد ازیں غیبت اور چغل خوری سے پرہیز، پیشاب کی نجاست سے تطہیر، یتیم کا مال اور سود کھانے سے پرہیز اور ناحق گواہی سے گریز ہے اور بعض حدیثوں میں اپنی زوجہ سے لاتعلقی نہ کرنا بھی مذکور ہے۔ اسی طرح اپنے اہل وعیال سے بد خلقی نہ کرنا اور نعمتوں کو ضائع نہ کرنا ایسے امور ہیں جو عذابِ قبر سے نجات دلانے والے ہیں۔[1]

عذاب قبر سے نجات کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ میت کے کفن پر وہ دو شعر لکھے جائیں جو امیر المومنین علیہ السلام نے سلمان رض کے کفن پر لکھے تھے:

ترجمہ ملاحظہ ہو:

"میں کریم کی بارگاہ میں نیکیوں اور قلبِ سلیم کا سامان سفر لیے بغیر ہی آگیا ہوں"۔

کیونکہ جب کسی کریم کے پاس جانا ہو تو سامانِ سفر کے ساتھ جانا نہایت برا ہے"۔

---

[1] حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ موجب عذاب قبر تین چیزیں ہیں۔ غیبت، چغل خوری اور پیشاب سے طہارت نہ کرنا (بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۴۵) اور کئی دوسری حدیثوں میں ہے کہ پیشاب سے طہارت نہ کرنا اور اسے معمولی سمجھنا گناہ ہے۔ نیز جناب پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ "فشار قبر مومن کے لیے کفارہ ہوتا ہے، نعمتوں کے ضائع کرنے کے گناہ کا" (البحار جلد ۶ صفحہ ۲۱۲)

اسی طرح یہ شعر جو حضرت علی ابن الحسین علیہما السلام کی طرف سے منقول ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

"میرا سامانِ سفر اتنا کم ہے کہ میں سمجھتا ہوں یہ مجھے
منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ پس میں قلتِ زادِ سفر پر
روؤں یا دُوریٔ مسافت پر!"

نیز روایت کی گئی ہے کہ دعاءِ جوشن کا کفن پر لکھنا، تربتِ حسینیہ (خاکِ شفا) کا میت کے ساتھ رکھنا اور مسند سلسلۃ الذہب کا کفن پر لکھنا مستحب ہے۔

اسی طرح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ نجفِ اشرف میں امیرالمومنین علیہ السلام کے جوار میں میت کے دفن کرنے سے عذابِ قبر اور زحمتِ سوالِ نکیرین سے وہ بچ جاتی ہے۔ امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "غری (یعنی نجف اشرف) اسی پہاڑ کا ایک حصّہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا اور اس کو مقدس بنایا۔ وہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیلؑ اور خاتم النبیینؐ کو حبیب بنایا اور اسے نبیوں کا مسکن قرار دیا۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ امیرالمومنینؑ نے پشت کوفہ پر نظر ڈالی اور فرمایا: "کتنا اچھا ہے تیرا منظر اور کتنی پاکیزہ ہے تیری گہرائی، خدایا! تو میری قبر یہیں بنا۔" اس تربت کے خواص میں سے یہ بھی ہے کہ عذابِ قبر ساقط ہو جاتا ہے اور یہاں دفن ہونے والے کا منکر و نکیر کی جانب سے محاسبہ نہیں ہوتا، جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا ہے۔

(الانوار النعمانیہ صفحہ ۴۵۶)

قاضی ابن بدر ہمدانی کوفی کہ جو نہایت ہی نیک و عبادت گزار آدمی تھے، ان سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: "ایک بارش والی رات میں مَیں مسجد کوفہ میں تھا۔ ایک گروہ نے مسجد کے باب مسلم پر دستک دی اور دروازہ کھولا گیا۔ تب ان میں سے کسی نے کہا: ہمارے ساتھ ایک جنازہ ہے۔ پھر وہ لوگ جنازہ اندر لے آئے اور اسے باب مسلم کے سامنے چبوترے پر رکھ دیا۔ اس اثنا میں ان میں سے ایک آدمی نے خواب دیکھا کہ وہ ایک اور شخص سے کہہ رہا تھا: کیا جنازہ کے منہ سے پردہ ہٹا کر ہم کو دیکھنا نہیں چاہیے کہ اس کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ پس اس نے میّت کا چہرہ کھولا اور اپنے ساتھی سے کہا: ہاں! اس کے ساتھ ہمارا تعلق ہے، ہمیں چاہیے کہ اس قافلہ کے رصافہ[1] پہنچنے سے پہلے اس کو یہاں سے اٹھالیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہمارے لیے کوئی ایسا موقع نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھی کو جگا کر اس کو اپنا خواب بتایا اور کہا: اس کو جلدی سے اٹھالو۔ پس انھوں نے وہ جنازہ وہاں سے اٹھالیا اور مشہد کی طرف چل پڑے۔ مشہد مقدّس میں جن حضرات کے مزار ہیں ان پر درود و سلام ہو۔ (انوار نعمانیہ صفحہ ۴۵۶)

خدایا! تو ہمیں اور تمام مومنین کو قرب و جوار امیرالمومنینؑ میں سکونت کی توفیق عطا فرما۔ جناب پیغمبرؐ اور ان کی عترت طاہرینؑ کے وسیلے سے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

"جب میں مرجاؤں تو مجھے حیدر کرارؑ کے جوار میں دفن کرو۔

---

[1] ایک موضع کا نام۔

وہ جو شبّر و شبیر کے پدر گرامی ہیں اور کیا کہنا انکی بلندی کا۔"
"میں ان کے جوار میں رہ کر نہ آتش جہنم سے ڈرتا ہوں
نہ منکر و نکیر سے!"
"کیونکہ اگر کوئی کسی کی پناہ میں ہوتا ہے تو پناہ دینے والے
کے لیے یہ بات معیوب ہوتی ہے کہ اس کی پناہ میں ہوتے
ہوئے کسی کا نقصان ہو جائے۔"

میت کے لیے دوسروں کے اعمال خیر

بعد ازیں وہ امور جو مرنے والے کے بعد اس کے لیے دوسروں کو کرنے چاہئیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کم از کم چالیس مومنین اس کے حق میں خیر و صلاح کی گواہی دیں۔ ان لفظوں میں کہ "خدایا! ہم اس کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتے اور تو ہم سے زیادہ جاننے والا ہے۔" کیونکہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ ان کی گواہی کو قبول کرتے ہوئے اس میت کو اخیار یعنی نیکوکاروں میں شمار کر لیتا ہے۔ خواہ وہ اشرار ہی میں سے کیوں نہ ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب کسی میت کے پاس چالیس مومن جمع ہو کر کہتے ہیں: ہم اس کے بارے میں خیر و نیکی کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔" تو اللہ عزوجل فرماتا ہے: "میں تم لوگوں کی گواہی کو قبول کرتا ہوں اور میں نے بخش دیا اس کے ان گناہوں کو جنہیں میں جانتا ہوں اور تم نہیں جانتے۔"[1]

ہمارے شیخ کلینی قدس اللہ روحہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۹۲۵، الانوار النعمانیہ صفحہ ۴۷

ابو عبداللہ الصادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "بنو اسرائیل میں ایک مرد عبادت گزار تھا۔ اللہ نے حضرت داوٴد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ وہ ریاکار ہے۔ لہٰذا جب وہ مرگیا تو حضرت داوٴدؑ اس کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے۔ مگر بنو اسرائیل میں سے دوسرے چالیس افراد نے اس کے لیے کہا: "خدایا! ہم اس کے بارے میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں جانتے اور تو ہم سے زیادہ جانتا ہے، پس اسے بخش دے"۔ پھر جب اسے غسل دیدیا گیا تو دوسرے چالیس افراد آئے اور انہوں نے بھی وہی گواہی دی۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٴد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: "تم کو اس شخص پر نمازِ جنازہ پڑھنے سے کس چیز نے روکا ہے؟" حضرت داوٴدؑ نے عرض کی: "اسی چیز نے جس کی تو نے مجھے خبر دی ہے۔" اللہ نے فرمایا: "اب جبکہ ایک گروہ نے اس کے حق میں گواہی دی ہے تو میں نے ان کی گواہی قبول کرلی ہے۔ خواہ میں وہ جانتا ہوں جو تم لوگ نہیں جانتے۔" (انوار النعمانیہ صفحہ ۴۵)

اس حدیث کے بعد علامہ سید جزائری اعلی اللہ مقامہٗ نے تحریر فرمایا: "اسی وجہ سے ہمارے علامہ معاصر (یعنی علامہ مجلسیؒ نے) اللہ ان کی حیات دائم رکھے، اپنے برادران مومنین سے درخواست کرکے اپنے کفن پر تربتِ حسینیہؑ (خاک شفا) سے اپنے ایمان کے بارے میں ان کی گواہیاں لکھوائی ہیں اور مومنین نے لکھا ہے کہ "ان کے ایمان کے بارے میں کوئی شبہ نہیں، فلاں فلاں نے گواہی دی" اور بعض مومنین نے تو اپنی مہریں بھی لگائی ہیں۔ علامہ مجلسیؒ دوسرے مومنین کو بھی ایسا کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور یہ بڑی اچھی بات ہے، بندہ جب رحیم و کریم کی بارگاہ میں

حاضر ہوتا ہے تو وہ ادنیٰ سے ادنیٰ عمل کو بھی قبول کر لیتا ہے۔"

دوسری تدبیر جریدتین (یعنی دو سبز شاخوں) کا میت کے ساتھ قبر میں رکھنا ہے خواہ مرنے والا چھوٹا ہو خواہ بڑا، مرد ہو یا عورت، نیکوکار ہو یا بدکار، ہر ایک کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ جب تک وہ ہری رہتی ہیں میت سے عذابِ قبر دُور رہتا ہے۔

تیسری تدبیر یہ ہے کہ مرنے والے کے عزیزو اقارب میں سے جو لوگ باقی ہوں وہ اس کے لیے نیکیاں کریں یعنی صدقہ و نماز، تلاوت قرآن مجید اور حج وغیرہ۔ کیونکہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ میت عذاب کی تنگی میں ہوتی ہے۔ مگر جب اس کے بھائیوں میں سے کوئی کسی نیکی کا اسے ہدیہ بھیجتا ہے تو ایک فرشتہ طبق نور لے کر اس کی قبر میں آتا ہے اور کہتا ہے: "فلاں شخص نے تمہارے لیے ہدیہ بھیجا ہے۔" پس میّت کے لیے وسعت ہو جاتی ہے اور عذاب دُور ہو جاتا ہے۔

چوتھی تدبیر وہ صدقہ جاریہ ہے جسے مرنے والا اپنی زندگی ہی میں پیش کر جاتا ہے۔ مثلاً کارِ خیر کے لیے کوئی وقف یا کوئی ایسا نیکی کا طریقہ جسے وہ خود کرتا رہا اور بعد والوں کو بھی اس پر عمل کرنے کے لیے کہہ گیا۔

پانچویں تدبیر ہیں کسی فرزند صالح کا موجود ہونا ہے۔ اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے ابو کہمش نے حضرت ابو عبداللہ الصادق علیہ السلام کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ امام ؑ نے فرمایا: "مردِ مومن اپنی موت کے بعد بھی چھ چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے:

۱۔ وہ فرزند صالح جو اس کے لیے استغفار کرتا رہے۔

۲۔ وہ مصحف جس کو لوگ پڑھتے رہیں۔
۳۔ وہ کنواں جو اس نے کھودا یا کھدوایا ہو۔
۴۔ اس کا لگایا ہوا درخت۔
۵۔ وہ چشمہ جسے اس نے خدا کی راہ میں جاری کیا ہو۔
۶۔ وہ اچھا طریقہ جسے اس کے بعد دوسروں نے اختیار کر لیا ہو۔[1]

اسی وجہ سے احادیث میں وارد ہوا ہے کہ والدین کی زندگی میں ان کے ساتھ نیکی کرنے والا بیٹا اگر ان کی موت کے بعد ان کے لیے کوئی نیکی نہ کرے تو وہ عاق شمار کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر والدین کی زندگی میں ان کی نافرمانی کرنے والا ان کی موت کے بعد ان کے لیے نیکی کرے تو فرمانبردار اور نیک شمار کر لیا جاتا ہے۔

بعض محققین نے عمرو ابن یزید سے امام صادقؑ کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ آپ ہر رات اپنے فرزند کی طرف سے دو رکعتیں پڑھتے تھے اور ہر دن اپنے والدین کی طرف سے دو رکعتیں ادا کرتے تھے۔ راوی نے سبب پوچھا تو امامؑ نے فرمایا: "اس لیے کہ فرش راحت کا وقت اولاد کے لیے ہوتا ہے۔" ان رکعتوں میں آپ سورۂ قدر اور سورۂ کوثر پڑھا کرتے تھے۔"[2]

اپنے مردوں پر رحم کرو

نماز ہدیۂ میت اس رات کے لیے ہے جو دفن کے بعد آئے۔ یہ دو رکعتیں ہیں۔ پہلی میں سورۂ حمد کے بعد ایک مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھی جائے اور دوسری میں سورۂ حمد کے بعد دس مرتبہ سورۃ القدر پڑھنی چاہیے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۹۳ [2] الانوار النعمانیہ صفحہ ۲۵۷

پھر جب سلام پھیرے تو کہے: "خدایا! محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیج اور اس نماز کا ثواب فلاں شخص کی قبر تک پہنچا دے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ حمد کے بعد دو مرتبہ سورۂ توحید (اخلاص) پڑھے اور دوسری رکعت میں سورہ حمد کے بعد دس مرتبہ سورۂ تکاثر پڑھے اور پھر مذکورہ دعا کرے۔

سید علی ابن طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الاقبال" میں حضرت حذیفہ ابن یمان سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "مرنے والے پر قبر کی پہلی رات سے بڑھ کر اور کوئی کڑی ساعت نہیں آتی۔ لہٰذا تم اپنے مُردوں پر رحم کرو ان کی طرف سے صدقہ دے کر اور اگر وہ میسّر نہ ہو تو ان کے لیے دو رکعت نماز پڑھو۔ پہلی رکعت میں سورہ حمد کے بعد دو مرتبہ سورۂ توحید (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) اور دوسری میں سورۂ حمد کے بعد دس مرتبہ سورۂ تکاثر پڑھو۔ پھر سلام پھیر کر کہو: "خدایا! درود بھیج محمدؐ و آل محمدؐ پر اور نماز کا ثواب فلاں ابن فلاں کی طرف بھیج دے۔" پس اس وقت اللہ تعالیٰ اس کی قبر کی طرف ایک ہزار فرشتوں کو لباس اور حلّوں کے ساتھ بھیج دیتا ہے اور قیامت تک کے لیے اس کی قبر میں وسعت کر دیتا ہے اور نماز پڑھنے والے کو آئندہ کے ہر دن کے لیے نیکیاں عطا فرماتا ہے اور اس کو چالیس درجے بلند کر دیا جاتا ہے۔

ابن بابویہ قمی قدس سرہٗ نے زہری کے حوالے سے روایت کی ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: "آدمی پر تین ساعتیں نہایت سخت ہوتی ہیں۔ پہلی ساعت وہ جب وہ موت کو دیکھتا ہے، دوسری وہ جب وہ اپنی قبر سے اٹھے گا اور تیسری جب وہ بارگاہ الٰہی میں کھڑا ہو کر

جنت یا جہنم کا منتظر ہو گا۔"

ملا فتح علی سلطان آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: "میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ جس میت کے جنازے میں خود شریک ہوتا تھا یا جس کے انتقال کی خبر سنتا تھا، میں اس کے دفن کی پہلی رات کو اس کے لیے نماز ہدیۂ میت پڑھ دیا کرتا تھا اور اس کے بارے میں ہرگز کسی کو خبر نہیں تھی۔ یہاں تک کہ میرے ایک عزیز دوست نے مجھے اپنا ایک خواب سنایا کہ انہوں نے اپنے ایک مُردہ دوست کو جس کے لیے میں نے نماز ہدیۂ میت پڑھی تھی، خواب میں دیکھا اور اس کا حال دریافت کیا تو اس نے کہا: "میں تو بڑی سختی و شدّت میں تھا۔ یہاں تک کہ ملا فتح علی نے میرے لیے ہدیہ بھیجا تو اللہ نے مجھے اس سختی و شدّت سے نجات دی۔ وہ ہدیہ دو رکعت نماز کا ثواب تھا۔" پھر اس شخص نے خواب ہی میں میرے لیے دعا کی۔ میرے دوست نے مجھ سے نماز کے بارے میں پوچھا تو میں نے ان کو ساری کیفیت بتا دی۔

زیارتِ رفتگاں

کتاب "دعوات الراوندی" میں داؤد رقی کے حوالے سے روایت ہے کہ انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: "کوئی شخص اپنے باپ یا کسی دوسرے عزیز کی قبر کے پاس جائے تو کیا صاحب قبر کو اس سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے؟" امامؑ نے فرمایا: "ہاں! بالکل اسی طرح جیسے کوئی تمہارے پاس اس زندگی میں آئے اور ہدیہ پیش کرے تو تمہیں خوشی ہوتی ہے، اسی طرح میت کو بھی فرحت حاصل ہوتی ہے۔"

امام جعفر صادقؑ ہی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "اگر تم لوگ طلوع آفتاب سے پہلے مرنے والوں کی زیارت کرو تو وہ تمہاری

باتیں بھی سنتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں اور جب تم اس کے بعد زیارت کرتے ہو تو وہ سنتے تو ہیں مگر جواب نہیں دیتے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت آئی ہے کہ آپ نے فرمایا: "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ ہر شب جمعہ بقیعِ مدینہ کی طرف جاتے تھے اور تین مرتبہ فرماتے تھے: سلام ہو تم پر اے اہلِ دیار!"

نیز عبداللہ ابن سنان کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابو عبداللہ صادق علیہ السلام سے پوچھا: "اہلِ قبور پر ہم کیسے سلام کریں؟" تو آپ نے فرمایا: "ہاں! تم کہو سلام ہو تم پر اے اہلِ دیار جو مومنین و مسلمین میں سے ہو۔ تم ہم سے پہلے چلے گئے اور ہم بھی انشاء اللہ تم سے آملنے والے ہیں۔" [1]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۳۹۶، اور اسی کتاب میں ہے کہ امیرالمومنین ع نے حضرت محمد ابن ابی بکر کو جو خط لکھا تھا، اس میں یہ بھی تھا: "اے بندگانِ خدا! وہ لوگ جن کی بخشش نہ ہو، ان کے لیے موت سے بڑھ کر دوسری منزل قبر کی ہوتی ہے لہٰذا تنگی و وحشتِ قبر سے ڈرو۔ قبر ہر روز آواز دیتی ہے: "میں غربت و وحشت اور کیڑوں کا گھر ہوں۔" قبر جنت کا ایک باغ ہے یا جہنم کا ایک گڑھا۔ جب مردِ مومن دفن ہوتا ہے تو زمین اس سے کہتی ہے: "خوش آمدید، تم ان لوگوں میں سے تھے جن کا میری پشت پر چلنا مجھے پسند تھا۔ پس اب جبکہ تم میری گود میں آگئے ہو تو تم دیکھو گے کہ میں کیسا اچھا سلوک کرتی ہوں۔" اس کے بعد اس کے لیے حدِ نظر تک وہ وسعت کر دیتی ہے اور جب کافر دفن ہوتا ہے تو زمین کہتی ہے: "تیرے لیے کوئی خوش آمدید نہیں۔ میری پیٹھ پر تیرے چلنے سے مجھے نفرت

بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کی روحیں اپنی اولاد و اقارب سے طالبِ رحم بھی ہوتی ہیں اور کہتی ہیں: "ہم سے غافل نہ ہو، ہماری مدد کرتے رہو، ہمیں فراموش نہ کرو اور جہاں تک ممکن ہو نماز، روزہ، حج اور کم سے کم صدقات کے ذریعے خواہ وہ ایک ٹکڑا روٹی ہی کیوں نہ ہو ہم پر رحم کرتے رہو۔ ہمارے لیے بھی ایسے ہی امکانات تھے اور ہم پر بھی خدا کی بے حد توفیقات تھیں مگر ہم نے غفلت برتی اور آج اس گڑھے میں ہم اندوہ و غم میں مبتلا ہیں۔"

تھی اور اب جبکہ تو میرے قبضے میں آگیا ہے تو دیکھ میں کیا کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اسے اتنا دباتی ہے کہ اس کی پسلیاں برابر ہو جاتی ہیں۔ وہ تنگ زندگانی جس سے اللہ نے ڈرایا ہے، وہ عذابِ قبر ہے جہاں کافر پر ننانوے سانپ مسلّط کر دیے جاتے ہیں جو اسے ڈستے رہتے ہیں اور یوم محشر تک اس کی ہڈیاں توڑتے رہتے ہیں۔ وہ ایسے زہریلے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی زمین پر پھونک مارے تو کوئی سبزی نہ اُگے۔ اے بندگانِ خدا! تمہارے نفس و جسم نہایت کمزور ہیں۔ تم ان میں سے ایک کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا وہ عمل کرو جو اللہ کو پسند ہے اور ہر اس کام کو چھوڑ دو جو اللہ کو ناپسند ہے۔" میں کہتا ہوں: یہاں فرزدق کے چند اشعار کا پیش کر دینا مناسب ہے۔ خلاصہ ملاحظہ ہو: "اگر اللہ نے مجھے معاف نہ فرمایا تو میں قبر کی اس آگ اور تنگی سے ڈرتا ہوں جو موت سے کہیں زیادہ سخت ہوگی۔ جب قیامت کے دن کوئی سخت گیر ہانکنے والا آئے گا اور فرزدق کو بھی ہانکنے لگے گا تو یقیناً محروم ترین اولادِ آدم وہ ہوں گے جو جہنمی لباس و زنجیر میں آتش جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔" (سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۳۹۵)

"جامع الاخبار" میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "مومنین کی روحیں ہر جمعہ کو آسمانِ دنیا سے آکر اپنے گھروں کے سامنے نہایت غمگین آواز میں پکارتی ہیں: اے میرے گھروالو! اے بیٹو! اے بابا! اے بھائی! اور اے میرے عزیزو! ہم پر مہربانی کرو! کوئی ایک درہم کا صدقہ دیکر یا کسی لباس کا صدقہ دیکر، اللہ تمہیں لباسِ جنت پہنائے گا۔" یہ کہہ کر خود پیغمبر اکرمؐ رو پڑے اور اصحاب بھی رونے لگے۔ پھر آنحضرتؐ نے فرمایا: "یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں تمہارے بھائی تھے۔ مگر اب نعمت و سرور کے بعد وہ خاک بن چکے ہیں اور اب پچھتا رہے ہیں کہ اگر انہوں نے اللہ کی اطاعت میں اپنا مال خرچ کیا ہوتا تو تمہارے محتاج نہ ہوتے اور یہ حسرت و ندامت ان کے لیے نہ ہوتی۔ پس تم اپنے مُردوں کے لیے صدقہ و نیکی میں جلدی کرو۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ماہِ رمضان کے ہر جمعہ کو روحیں اپنے گھر کے پاس آکر غمگین آواز میں ایک ایک کو پکارتی ہیں اور کہتی ہیں: "اے میرے عزیزو! میں ایک تنگ قید خانے میں شدتِ غم کے ساتھ پڑی ہوں۔ لہٰذا تم ہم پر رحم کرو اور ہمارے لیے دعا و صدقہ کرنے میں بخل سے کام نہ لو۔ ممکن ہے اللہ تمہارے ذریعے ہم پر رحم فرمائے۔ قبل اس کے کہ تم بھی ہماری طرح ہو جاؤ۔ افسوس کہ ہم نیکی کرنے پر اسی طرح قادر تھے جیسے آج تم ہو۔ لہٰذا خدا کے بندو، ہماری بات سنو اور ہمیں فراموش نہ کرو۔ کیونکہ عنقریب تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ فاضل دولت جو تمہارے پاس ہے وہ کچھ عرصہ پہلے ہمارے پاس تھی۔ مگر ہم نے اسے راہِ خدا میں خرچ نہیں کیا اور حقدار کو بھی اس سے محروم رکھا۔ لہٰذا وہ دولت اب ہم پر وبال بن گئی ہے اور

ہمارے لیے اس کا کوئی فائدہ نہیں رہا۔ یہی حال تمہارا بھی ہو جائے گا۔ لہٰذا ہم پر کسی ایک درہم یا روٹی یا اس کے ٹکڑے ہی سے رحم کرو۔" یہ لکڑیاں پکارتی ہیں: "بہت جلد تم خود بھی اپنے آپ پر بکا کرو گے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جیسے آج ہم رو رہے ہیں اور کچھ نہیں ملتا۔ پس اگر کچھ کرنا ہے تو مرنے سے پہلے کرلو۔"

یہ وہ امور ہیں جو انسان کو اس کی موت کے بعد نفع پہنچا سکتے ہیں۔ خود اس کے اعمال میں سے ہوں یا اس کے سوا دوسروں کے اعمال میں سے۔ ان کے علاوہ بھی مرنے والے کو نفع پہنچانے والی کچھ نیکیاں ہوتی ہیں۔ پروردگار رحیم و کریم ہے اور اس کی بارگاہ میں بخشش کے لیے کوئی ذرا سا بھی عملِ خیر بہانہ بن جاتا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور جملہ مومنین و مومنات کے لیے عملِ صالح کی توفیق چاہتے ہیں۔ وہ بہترین توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا ہے۔

● چھٹا مرحلہ

معاد

یاد رہے کہ لفظ "معاد" تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے: معنیٰ مصدری یعنی واپس ہونا اور مقام و زمانۂ واپسی ــــ ان تینوں معانی کا حقیقی مفہوم ایک ہے۔

پروردگار عالم نے اس دن کو بہت سے ناموں سے ذکر فرمایا ہے:

۱ــــ یوم القیامت، یعنی کھڑے ہونے کا دن (سورۂ قیامت - آیت ۶)

۲ــــ یوم الساعۃ، اہم ترین گھڑی کا دن (سورۂ حج - آیت ۷)

۳ــــ یوم البعث، اٹھائے جانے کا دن (سورۂ روم - آیت ۵۶)

۴ــــ یوم الحشر، اکٹھا کیے جانے کا دن (سورۂ قٓ - آیت ۴۴)

۵ــــ یوم الجمع، سب کو جمع کیے جانے کا دن (سورۂ تغابن - آیت ۹)

۶ــــ یوم الحساب، حساب کتاب کا دن (سورۂ صٓ - آیت ۲۶)

۷ــــ یوم التلاق، ملاقات کا دن (سورۂ غافر - آیت ۱۵)

۸۔۔۔ یوم التناد، چیخ پکار کا دن (سورۂ غافر۔ آیت ۳۲)

۹۔۔۔ یوم الآزفۃ، جلد آنے والا دن (سورۂ غافر۔ آیت ۱۸)

۱۰۔۔۔ یوم التغابن، چھپی ہوئی خیانت کے ظاہر ہونے کا دن (سورۂ تغابن۔ آیت ۹)

۱۱۔۔۔ یوم الفصل، فیصلے کا دن (سورۂ مرسلات۔ آیت ۳۸)

۱۲۔۔۔ الطامۃ الکبریٰ، سب سے بڑی مصیبت کا دن (سورۂ نازعات آیت ۳۴)

۱۳۔۔۔ الیوم الموعود، وعدے کا دن (سورۂ بروج۔ آیت ۲)

۱۴۔۔۔ الیوم المشہود، گواہی کا دن (سورۂ ہود۔ آیت ۱۰۳)

۱۵۔۔۔ یوم الدین، جزا و سزا کا دن (سورۂ صافات۔ آیت ۲۰)

۱۶۔۔۔ الواقعہ، واقع ہونے والا (سورۂ واقعہ۔ آیت ۱)

۱۷۔۔۔ الحاقّۃ، حق رسی کا دن (سورۂ حاقہ۔ آیت ۱-۲)

۱۸۔۔۔ القارعہ، کھڑکھڑا دینے والا دن (سورۂ قارعہ۔ آیت ۱-۲)

۱۹۔۔۔ الراجفۃ، ہلا دینے والا دن (سورۂ نازعات۔ آیت ۶)

۲۰۔۔۔ یوم النشور، جی اٹھنے کا دن وغیرہ (سورۂ فاطر۔ آیت ۹)

پروردگار عالم نے اس دن کے خوفناک احوال کو مختلف لفظوں میں بیان کیا ہے۔

معاد کے خوفناک احوال

- مثلاً فرمایا: "وہ ڈراؤنا اور سخت ترین دن ہوگا" (سورۂ دہر۔ آیت ۱۰)
- اور فرمایا: "اس دن گنہگاروں کو پگھلے ہوئے سیسے جیسا گرم پانی

دیا جائے گا۔" (سورۂ کہف - آیت ۲۹)

- اور فرمایا: "اس دن پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہوں گے۔"
(سورۂ قارعہ - آیت ۵)

- اور فرمایا: "اس دن دل اور نگاہیں الٹ پلٹ ہو رہے ہوں گے۔"
(سورۂ نور - آیت ۳۷)

- اور فرمایا: "جس دن زمین بدل کر دوسری کر دی جائے گی۔"
(سورۂ ابراہیمؑ - آیت ۴۸)

- اور فرمایا: "جس دن آسمان کو کتابی صفحات کی طرح لپیٹ لیا جائیگا۔"
(سورۂ انبیاء - آیت ۱۰۴)

- اور فرمایا: "جب سورج کو گھما دیا جائے گا۔"
(سورۂ تکویر - آیت ۱)

- اور فرمایا: "جس دن روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے۔"
(سورۂ نبا - آیت ۳۸)

- اور فرمایا: "پس جب نگاہ خیرہ ہو جائے گی اور چاند گہنا جائے گا۔"
(سورۂ قیامت - آیت ۷ - ۸)

- اور فرمایا: "جب آسمان پھٹ پڑے گا ستارے بکھر جائیں گے اور سمندر امنڈ پڑیں گے۔"
(سورۂ انفطار - آیت ۱ تا ۳)

- اور فرمایا: "اس دن حیّ و قیوم کی بارگاہ میں چہرے جھکے ہونگے۔"
(سورۂ طٰہٰ - آیت ۱۱۱)

- اور فرمایا: "اس دن خدائے رحمان کے سامنے آوازیں انکساری سے دبی ہوں گی۔
(سورۂ طٰہٰ - آیت ۱۰۸)

- اور فرمایا: "اس دن پنڈلیاں برہنہ ہوں گی اور کفار کو سجدے کی طرف بلایا جائے گا۔" (سورۂ قلم۔آیت ۴۲)
- اور فرمایا: "پس مجرموں کو پیشانی کے بالوں اور پیروں سے پکڑا جائے گا۔" (سورۂ رحمٰن۔آیت ۴۱)
- اور فرمایا: "وہ دن جب کچھ چہرے نورانی ہوں گے تو کچھ دوسرے سیاہ ہوں گے۔" (سورہ آل عمران۔آیت ۱۰۶)
- اور فرمایا: "اس دن آنکھیں چڑھی ہوں گی۔" (سورۂ ابراہیمؑ۔آیت ۴۲)
- اور فرمایا: "اس دن ظالم ندامت سے اپنے ہاتھ اپنے ہی دانتوں سے کاٹ رہا ہوگا۔" (سورۂ فرقان۔آیت ۲۷)
- اور فرمایا: "وہ دن کافروں پر بڑا سخت ہوگا۔" (سورۂ فرقان۔آیت ۲۶)
- اور فرمایا: "اللہ حکم دے گا، اے مجرمو! الگ ہو کے کھڑے ہو جاؤ۔" (سورۂ یٰسٓ۔آیت ۵۹)
- اور فرمایا: "آج کے دن ہم ان کے لبوں پہ مہر لگا دیں گے اور جو جو کارستانیاں یہ لوگ دنیا میں کر رہے تھے خود ان کے ہاتھ ہم کو بتا دیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے۔" (سورۂ یٰسٓ۔آیت ۶۵)

واضح رہے کہ دنیاوی جسم کا لوٹایا جانا، وہ نظریہ ہے جس پر تمام ملت کا اتفاق ہے۔ یہ اصول عقائد میں داخل ہے اور اس کا منکر اسلام سے خارج ہے اور اس پر قرآن مجید کی آیاتِ کریمہ صریحاً دلالت کرتی ہیں

اوران کی کوئی دوسری تاویل غیر معقول ہے۔ اسی طرح اس موضوع پر اتنی متواتر احادیث وارد ہوئی ہیں کہ ان کو رد کرنا یا ان پر طعن کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار کی جلد۷ صفحہ ۵۳ پر لکھا ہے کہ "احوط و اولیٰ یہی ہے کہ معاد جسمانی اور اس کی تمام خصوصیات کے بارے میں قرآن و حدیث سے جو نصوصِ متواترہ وارد ہوئے ہیں ان کی تصدیق کی جائے اور جزئیات کے بارے میں غور و خوض نہ کیا جائے۔ کیونکہ اول تو ہم اس کے بارے میں غور و خوض کے مکلف نہیں ہیں اور دوئم یہ کہ اس طرح کے غور و خوض سے کبھی ایسا خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے جو مطابق واقع نہ ہوگا۔"

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے اپنی اسی کتاب میں شرح عقدیہ سے علامہ دوانی کا یہ کلام بھی نقل کیا ہے کہ لفظ معاد سے معاد جسمانی ہی کی طرف ذہنی تبادر ہوتا ہے کیونکہ اس معنی میں اہل شرع اس کو استعمال کرتے ہیں۔ اسی کا اعتقاد واجب ہے اور اس کا منکر کافر ہو جاتا ہے۔ یہ نظریہ مسلمانوں، نصرانیوں اور یہودیوں سب کے نزدیک اجماعاً حق ہے اور اس کی حقانیت پر قرآن مجید کی آیات محکمہ یوں شاہد ہیں کہ ان کی کوئی اور تاویل نہیں ہو سکتی ہے۔ مثلاً سورۂ یٰسٓ کی ۷۷ تا ۷۹ ویں آیات جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیتیں اس وقت نازل ہوئی تھیں جب اُبَیّ ابن خلف ایک بوسیدہ ہڈی لیکر رسول اللہؐ کے پاس آیا تھا اور اس نے کہا تھا: "اے محمدؐ! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اللہ اس کو بھی زندہ کردے گا؟" تو رسول اللہؐ نے فرمایا تھا: "ہاں! اور اللہ

تجھے بھی دوبارہ اٹھائے گا اور جہنّم میں ڈالے گا۔"

یہ واقعہ ہر قسم کی مخالفانہ تاویل کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اسی وجہ سے امامؑ نے فرمایا ہے: "انصاف یہی ہے کہ نبی اکرمؐ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لانا اور معاد جسمانی سے انکار کرنا یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں۔

(بحار الانوار جلد ۷ صفحہ ۴۸-۴۹)

پس معلوم ہوا کہ پیغمبر اکرمؐ نے بذریعہ وحی اُبّی ابن خلف سے فرمایا کہ "تو پہلے سے موجود نہیں تھا، بلکہ اللہ تجھ کو عدم سے وجود میں لایا۔ لہٰذا وہ خالق جو اس پر قادر ہے وہ تجھے دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ مگر تو حق و انصاف سے انحراف کرتے ہوئے اس بوسیدہ ہڈی کے ذریعے جھگڑا کرنے آیا ہے اور خود اپنی خلقت کو بھولا ہوا ہے کیونکہ تو اپنی جہالت سے یہ نہیں سمجھا کہ وہ خالقِ حقیقی جس نے آسمان و زمین سب کو پیدا کیا، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ متفرق ذرات کو پھر سے جمع کر دے اور پھر انہیں زندہ کر دے؟"

یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ مومن کے ذرات بدن کافر کے ذرات بدن سے اسی طرح ممتاز ہوتے ہیں جیسے مٹی سے سونا ممتاز ہوتا ہے۔ قدرت والا خالق وہ ہے جس نے سبز درخت سے آگ پیدا کی۔[1] (سورۂ یٰسٓ۔ آیت ۸۰)

---

[1] جزیرہ عرب میں "مرخ" اور "عفار" نام کے دو درخت ہوتے تھے جن کی شاخیں کاٹنے سے دودھ جیسا مادہ نکلتا تھا لیکن جب دونوں کا پانی ایک دوسرے سے مل جاتا تھا تو آگ پیدا ہوتی تھی۔ پس دونوں درختوں کی شاخوں کو رگڑنے سے آگ نکلتی تھی۔ یہ تری سے آگ نکلنا اللہ کی قدرت ہے۔

نظریۂ قیامت اور عقل

قرآن وحدیث کے دلائل نقلیہ سے قطع نظر کرکے اگر ہم عقلی اعتبار سے غور کریں، تب بھی قیامت کا نظریہ صحیح ثابت ہوتا ہے اور وہ یوں کہ اس عظیم کائنات پر غور کیجیے جس کے ذرّے ذرّے میں حکمت ومصلحت پوشیدہ ہے۔ وہ یقیناً بے مقصد وعبث نہیں پیدا کی گئی۔

پھر اس کائنات میں انسان کی خلقت پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ ولادت سے لے کر بچپن، جوانی اور بڑھاپے تک اس پر کیسے کیسے تغیرات وارد ہوتے ہیں۔ پھر شب وروز کا طاری ہونا اور صحت وبیماری کے بعد موت آنا، کیا یہ سب کچھ بلا مقصد ہے؟ کیا انسانی زندگی بھی دوسرے حیوانات کی طرح محض کھانے پینے اور مرجانے کے لیے ہے؟ اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر انسان کو عقل جیسی عظیم نعمت سے سرفراز کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان امور پر سلامت روی سے غور کیجیے تو انسانی زندگی کا اعلیٰ مقصد بھی سمجھ میں آتا ہے اور پھر حیات اخروی اور قیامت کا نظریہ بھی بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے۔

وہ لوگ جو حیات اخروی اور قیامت سے انکار کرتے ہیں درحقیقت وہ اس عظیم کائنات اور پھر اس میں انسان کی خلقت میں پوشیدہ ان عظیم حکمتوں کا انکار کرتے ہیں جن کو تسلیم کیے بغیر تخلیق کائنات کا راز سمجھ میں نہیں آسکتا۔

جہاں تک حکمتوں اور مصلحتوں کا تعلق ہے تو وہ ذرّے ذرّے میں موجود ہیں اور ان کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر انسانی جسم ہی کو لیجیے اور اس کے حقیر ترین عضو سے لیکر اہم ترین عضو کا مشاہدہ کر لیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر عضو کا کوئی نہ کوئی کام ہے اور ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت

ہے۔ مثلاً ناخنوں اور بالوں ہی کو لے لیجیے۔ جہاں تک ناخنوں کا تعلق ہے تو وہ انگلیوں کی مدد کے لیے نہایت ضروری ہیں اور اگر وہ نہ ہوں تو بہت سے کام نہ کیے جا سکیں۔ ناخن کھجلانے میں بھی کام آتے ہیں اور ان کے ذریعے کچھ زائد مادہ خارج بھی ہوتا ہے، اس لیے ان کو کاٹنے کا حکم ہے۔

اسی طرح جسم انسانی میں کوئی بال بھی بے فائدہ نہیں ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "کچھ نا سمجھ لوگ بعض مقامات پر اگنے والے بالوں کو معیوب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں بالوں کا نہ ہونا ہی بہتر تھا۔ حالانکہ انہیں نہیں معلوم کہ اگر ان بالوں کے ذریعے جو خاص رطوبتیں خارج ہوتی ہیں وہاں بال نہ ہوتے تو انہی رطوبتوں سے امراض پیدا ہوتے۔ اسی وجہ سے ان بالوں کو ہر دو ہفتے میں صاف کرنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ رطوبتیں خارج ہوتی رہیں۔"

جب انسانی جسم کے نہایت حقیر اجزاء کا یہ حال ہے تو کیا کوئی عاقل شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ بنانے والے نے اس پورے جسم کو بے مقصد بنایا ہے؟ [1]

اس عالم موجودات کے ہر جزو کو آپ حکمت و مصلحت پر مبنی پائیں گے اور ہر چیز کا وظیفہ معین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حکیم جالینوس نے

---

[1] پروردگار عالم فرماتا ہے: "کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف واپس نہیں کیے جاؤ گے؟"
(سورۂ مومنون آیت ۱۱۵)

ایک دن غلاظت کے کیڑے (گبریلے) کو دیکھ کر کہا: "اس مخلوق کا کوئی فائدہ نہیں۔" پھر اس کی آنکھوں میں ایسا درد اٹھا کہ بڑے بڑے ماہر طبیب اس کے علاج سے قاصر رہے۔ اسی اثنا میں ایک بوڑھی عورت آئی اور اس نے کہا: میرے پاس ایک ایسا سرمہ ہے جو تمہارے لیے مفید ہوگا۔" جب جالینوس نے وہ سرمہ لگایا تو اسے پورا آرام آگیا۔ بعد میں اس نے اس بوڑھی عورت سے اس سرمے کے اجزا دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ گوبریلا اس کا ایک اہم جزو تھا۔

پس جب ہر ذرہ کسی نہ کسی کام اور مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور جسم کا ایک ایک حصہ کسی نہ کسی مصلحت و مقصد کے لیے بنا ہے تو نفس انسانی کا بے مقصد ہونا کیسے ممکن ہے؟

اس زمانے کے علمائے علم الابدان اس امر پر متفق ہیں کہ وہ جسم انسانی کے اعضاء و جوارح کے بارے میں کچھ عرصہ پہلے تک وہ حقیقتیں نہیں جانتے تھے جو اب ان پر منکشف ہوتی ہیں۔ مثلاً آنت کا وہ زائد حصہ جسے اپنڈکس کہا جاتا ہے، کچھ عرصہ پہلے تک بے فائدہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض تندرست افراد بھی اسے آپریشن کے ذریعے نکلوا دیا کرتے تھے۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ وہ دوسری آنتوں کی خاطر خطرے کی گھنٹی کا کام دیتی ہے اور تندرست لوگوں کو اسے ہرگز نہیں نکلوانا چاہیے۔ اس کے علاوہ بھی اس کے فوائد ہوسکتے ہیں جو ابھی معلوم نہیں ہوئے۔

اسی طرح کوئی دانت بے فائدہ نہیں ہے۔ پچھلے دانتوں کا جو کام ہے وہ اگلے دانت نہیں کرسکتے اور اگلے دانتوں کا کام پچھلے دانتوں سے نہیں ہوسکتا۔ یہی حال ہڈیوں، نسوں اور رگوں کا ہے، تو کیسے ممکن ہے کہ خود جسم

انسانی اور اس کا نفس بے مقصد ہو۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ خالق علیم وحکیم نے ہر چیز کو کسی حکمت و مصلحت سے پیدا کیا ہے اور کوئی چھوٹی سی چیز بھی بے حکمت و مصلحت نہیں ہے تو جسم انسانی میں اس عجیب و غریب صناعی اور پھر عالی ترین نفس و عقل انسانی کے بارے میں یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ محض تھوڑے دنوں کے لیے پیدا ہو کر ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے گا اور اس کی زندگی کا کوئی مقصدِ اعلیٰ نہ ہو گا؟ اور ظاہر ہے کہ جب مقصدِ اعلیٰ کا تسلیم کرنا عقلاً ضروری ہے تو موت کے بعد جزا و سزا کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسانی زندگی کی مقصدیت و مصلحت نہ متعین ہوتی ہے نہ یہاں کے دکھوں ناانصافیوں، محرومیوں اور مظالم کا کوئی مداوا ہو سکتا ہے۔

لہٰذا عقل سلیم کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ اس چند روزہ زندگی کے بعد ایک حقیقی و پائدار زندگی یقیناً ہے۔ جہاں اس دنیا کی ناانصافیوں اور یہاں کے دکھوں کا نعمت و راحت کی شکل میں بدلہ مل سکے۔ یہاں نیکوکار اکثر اوقات اسی طرح سوچتا ہے۔ جیسے شاعر نے کہا ہے ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویران بروم
راحتِ جاں طلبم از پئے جانان بروم

اگر انسان اپنے وجدان اور اپنی عقل کی طرف رجوع کرے تو یقیناً اسے معاد کی ضرورت کا یقین آجائے گا۔ کیونکہ اگر معاد نہ ہو اور جزا و سزا نہ ہو تو حیاتِ دنیوی میں تکلیفِ عمل خیر بے مقصد ہو جائے اور اگر تکلیفِ عمل کا تصور نہ ہو تو انسانی زندگی کی مقصدیت ختم ہو جائے لیکن چونکہ مقصدِ حیات کا نہ ہونا باطل ہے لہٰذا معاد کا ہونا ضروری ہے۔ نظریہ معاد سے

انحراف کا سبب لذتوں اور شہوتوں میں انہماک ہے اور بہت سے لوگ انھی شہوات ولذات میں ڈوب کر عقیدۂ معاد کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے بھی دل مطمئن نہیں ہوتے۔

بہرطور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ ساری کائنات ایک مقصد کے تحت پیدا کی گئی اور اس دنیاوی زندگی کے بعد یقیناً ایک اور زندگی ہے اور ایک نیا عالم ہے۔

عدل دلیلِ معاد ہے

یہ بات اپنے مقام پر تحقیق کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے کہ عدل، باری تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور یہی عدل دلیلِ معاد ہے۔ کیونکہ پروردگارِ عالم اپنے احکام اور فیصلوں میں ہرگز کوئی ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے اطاعت گزار بندوں کو ثواب دیتا ہے اور نافرمانی کرنے والوں کو سزا دینے کا حق رکھتا ہے۔ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف عمل نہیں دیتا اور کسی پر اس کے استحقاق سے زیادہ عذاب نہیں کرتا۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ عدل ہی نبوت، امامت اور معاد سب کی بنیاد ہے۔ عدل ہی سے آسمان و زمین قائم ہیں۔ یہ تقاضائے عدل ہی تھا کہ اللہ نے اپنے رسول ؐ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا۔ یہ تقاضائے عدل ہی تھا کہ اس نے اپنے رسولوں کو برگزیدہ و اخیار میں سے قرار دیا۔ ظالمین و اشرار میں سے نہیں۔ یہ تقاضائے عدل ہی تھا کہ اس نے منصب امامت و خلافت پر کسی کو مقرر کرنے کا اختیار امت کو نہیں دیا بلکہ خود اپنے دست قدرت میں رکھا۔ یہ تقاضائے عدل ہی ہے کہ وہ کسی نیکوکار کے اجر کو ضائع نہیں ہونے دیتا اور یہ تقاضائے عدل ہی ہے کہ یوم جزا میں جب تمام لوگ اس

کے حضور میں کھڑے ہوں گے' وہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا یا سزا دیگا۔

معلوم ہوا کہ عدل الٰہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ قیامت کے دن ان نیکوکاروں کو بہترین جزا عطا فرمائے جو زندگی بھر نیکیاں کرتے رہے اور وہ لوگ جنہوں نے اپنی زندگی ظلم وجور اور قتل وغارت میں بسر کی انہیں ایسی سزا دے جس کے وہ مستحق ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر لوگوں کو اس کا علم نہ ہو کہ اللہ اپنی اطاعت کرنے والوں کو بہترین جزا دیتا ہے تو وہ عبادت الٰہی سے جو مقصد خلقت ہے' روگردانی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں"

(سورۂ ذاریات - آیت ۵۶)

مگر انسان اللہ کی عبادت اسی اعتماد پر کر سکتے ہیں کہ ان کی محنت ضائع نہیں ہو گی۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی ایسے دن کا ہونا ضروری ہے جس دن ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائے[1] نیکی کی جزا ملے اور برائی کی سزا۔ ناحق قتل ہونے والا اپنے قاتل سے یوم جزا ہی میں بدلہ لے گا[2] اور اسے ظلم کا بدلہ ملے گا۔

---

[1] آج کے دن ہر نفس کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔ آج کوئی ظلم نہیں ہو گا۔ (سورۂ غافر - آیت ۱۷)

[2] جب زندہ درگور بچی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی۔ (سورۂ تکویر - آیت ۸-۹)

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر معاد نہ ہو تو اہل خیر اور اہل شر برابر ہو جائیں گے اور مظالم کی کوئی دادرسی نہ ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ انبیاء کو بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وعدہ و وعید اور ترغیب و ترہیب سب بیکار ہو جائیں گے اور افضل الانبیاء (معاذ اللہ) اشقی الاشقیاء کے برابر ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس دنیا میں جو رنج و راحت، فقر و غنا اور صحت و مرض کا سامنا ہوتا ہے وہ اعمال کی جزا یا سزا نہیں بلکہ محض امتحان ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

"اس نے موت و حیات کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ تم سب کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ تم میں بہترین عمل والا کون ہے۔" (سورۂ ملک۔ آیت ۲)

نیز وہ فرماتا ہے:

"ہم نے ان کی نیکیوں اور برائیوں سے آزمائش کی۔"
(سورۂ اعراف۔ آیت ۱۶۸)

اور وہ فرماتا ہے:

"تمہارے اموال و اولاد تو بس تمہاری آزمائش ہیں۔"
(سورۂ انفال۔ آیت ۲۸)

عدل الٰہی سے حقیقت معاد پر استدلال کا یہ مختصر سا خلاصہ ہے[1] اور

---

[1] کتاب جامع السعادات جلد ۱ صفحہ ۸۱ میں ہے کہ جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ عدالت کے معنی بقدر امکان مساوات کے ہیں تو یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بدلے ہم پر اس کا حق ہے جس کو پورا کرنا ضروری ہے،

اس استدلال کی وضاحت ان آیات سے بھی ہوتی ہے جن کی طرف اسمائے یوم قیامت کے سلسلے میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ان آیتوں میں دوبارہ زندہ کیے جانے کی اس طرح صراحت ہے کہ اسے کسی اور طرف نہیں موڑا جا سکتا۔

بلکہ بعض آیات میں ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کو بلا فاصلہ ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں۔"

(سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۱۴)

اور فرمایا:

"جو ایمان لائے اللہ اور یوم آخر پر اور نیک عمل کرے تو ایسے لوگوں کے لیے ان کا اجر ہے۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۶۲)

اور فرمایا:

"مگر نیکی ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ، یوم آخر، ملائکہ، کتابوں اور نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔"

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۷۷)

اور فرمایا:"

"جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے اور عمل صالح بھی

مگر چونکہ پروردگار غنی مطلق ہے لہٰذا ہم اس کا حق نعمت یوں ادا کر سکتے ہیں کہ اس کی معرفت و محبت کے ساتھ اس کے احکام کی اطاعت کریں، حالانکہ توفیق معرفت و اطاعت بھی اس کی ایک عظیم نعمت ہے۔ بہرحال جب بندہ اپنے اختیار کی حد تک اطاعت کرتا ہے تو وہ مستحق اجر بھی ہوتا ہے۔

کرے تو ایسے لوگوں کے لیے کوئی خوف نہیں ہوگا۔"

(سورۂ مائدہ - آیت ۶۹)

اور فرمایا:

"یقیناً اللہ کی مسجدوں کو بس وہی لوگ آباد کرتے ہیں
جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں۔"

(سورۂ توبہ - آیت ۱۸)

پروردگارِ عالم نے اپنے بندوں پر لطف و کرم کرتے ہوئے قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے بار بار معاد کا تذکرہ کیا ہے کیونکہ اسے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے اور اس کے بارے میں شکوک و شبہات زیادہ لاحق ہوتے ہیں۔ کبھی معاد کا ذکر اس انداز میں کیا کہ وہ یقیناً ہونے والی ہے اور ایسی حقیقت ہے جس پر کسی استدلال کی ضرورت نہیں۔

مثلاً فرمایا:

"جو ذرّہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو
ذرّہ برابر بھی برائی کرے گا وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔"

(سورۂ زلزال - آیت ۷-۸)

اور ارشاد ہوا:

"یقیناً اللہ ان لوگوں کو دوبارہ اٹھائے گا جو لوگ قبروں
میں ہیں۔" (سورۂ حج - آیت ۷)

اور فرمایا:

"اللہ مُردوں کو دوبارہ اٹھائے گا۔" (سورۂ انعام - آیت ۳۶)

پھر کبھی پروردگار قسم کھا کر معاد کا ذکر فرماتا ہے۔ مثلاً:

"وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کبھی بھی دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے۔ کہہ دیجیے (اے نبیؐ) کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ میرے رب کی قسم' تم سب ضرور پھر سے اٹھائے جاؤ گے اور جو کچھ تم نے یہاں کیا ہوگا اس کی تمہیں خبر دی جائے گی"۔ (سورۃ تغابن۔ آیت ۷)

اور کچھ دوسرے مقامات پر رب العالمین اس استدلال کے ساتھ معاد کا ذکر کرتا ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کیا تم نے رحم میں منی کے عمل کو دیکھا ہے۔ کیا تم اس سے بچہ پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں"۔

(سورۃ واقعہ۔ آیت ۵۸-۵۹)

اور وہ فرماتا ہے:

"اگر تم دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جانے سے متعلق شبہے میں ہو تو سن لو کہ ہم نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے' پھر نطفے سے' پھر خون بستہ سے' پھر پورے سڈول یا ادھورے سے گوشت کے لوتھڑے سے تاکہ ہم تم پر اپنی قدرت ظاہر کر دیں اور ہم ارحام میں جیسے چاہتے ہیں ایک معین مدت تک رکھتے ہیں۔ پھر ہم تمہیں طفلگی کے عالم میں وہاں سے نکالتے ہیں۔ تاکہ تم آہستہ آہستہ اپنی پوری قوت تک پہنچ جاؤ۔ تم میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں اور تم میں سے کچھ وہ ہوتے ہیں جو بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جاتے ہیں تاکہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانیں اور تم زمین کو خشک دیکھتے ہو مگر جب

ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ ابھرنے اور بڑھنے لگتی ہے
اور وہ ہر طرح کے خوبصورت پودے اگانے لگتی ہے۔ یہ سب
کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہی مُردوں کو
زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یقیناً
قیامت کی گھڑی آنے والی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں
اور یقیناً اللہ ان لوگوں کو پھر سے زندہ کر کے اٹھائے گا جو
قبروں میں ہوں گے۔" (سورۂ حج۔ آیت ۵ تا ۷)

گویا خداوند عالم بتا رہا ہے کہ "اگر تم لوگ دوبارہ زندہ کیے جانے کے بارے میں شک و شبہہ کرتے ہو تو یاد رکھو کہ ہم نے تمہارے جدِّ اوّل یعنی حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا۔ لہٰذا وہ خالق جس نے مٹی کو ابوالبشر بنا دیا کیا وہ بوسیدہ ہڈیوں کو پھر سے زندگی دینے اور مُردوں کو زندہ کر دینے پر قادر نہیں ہے؟ پھر ہم نے نسل آدمؑ کو پہلے نطفے، پھر جمے ہوئے خون، پھر گوشت کے لوتھڑے کی حالت سے گزار کر پیدا کیا۔ یہ لوتھڑا کبھی پوری خلقت پاتا ہے اور کبھی نہیں پاتا یا یہ کہ اس میں کبھی صورت پیدا ہوتی ہے اور کبھی نہیں بھی پیدا ہوتی بلکہ یونہی ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ سارا سلسلہ اس امر کی وضاحت کے لیے ہے کہ ہم تمہارے لیے اپنی قدرت کا مظاہرہ کریں کہ جو ابتدائے تخلیق پر قادر ہے وہ دوبارہ تخلیق پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ پھر ہم تمہیں رحمِ مادر میں اپنی مرضی کے مطابق ایک معین وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ بعد ازاں تم ماں کے پیٹ سے بحالتِ طفلی باہر آتے ہو۔ پھر آہستہ آہستہ نشو و نما پا کر عقل اور قوت جسمانی کے لحاظ سے مضبوط ترین حالت تک پہنچ جاتے ہو۔ تم میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلوغ و کمال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں اور تم میں

سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عمر کی سب سے ناکارہ حالت تک پہنچ جاتے ہیں جبکہ علم و شعور کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔"

خالقِ عالم حیات بعد الموت پر ایک دوسرے انداز سے دلیل لاتا ہے اور فرماتا ہے: "تم بے آب و گیاہ زمین کو دیکھتے ہو جس میں کوئی پودا نہیں ہوتا۔ پھر اسی زمین پر جب ابرِ رحمت برس جاتا ہے تو وہ گویا حرکت میں آجاتی ہے۔ ہریالی سے لہلہانے لگتی ہے اور اس میں ہر قسم کے خوش رنگ پودے اگنے لگتے ہیں۔ یہ سارے تغیرات اس لیے رونما ہوتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ حق ہے اور وہی تنہا اس طرح کے تغیرات کرنے والا ہے۔ لہٰذا بس وہی عبادت کے لائق ہے۔ کیونکہ وہی مُردوں کو پھر سے زندگی دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر بھرپور قدرت رکھتا ہے۔ وہ موت کے بعد بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے زمین خشک ہو کر مردہ ہو جاتی ہے۔ پھر اللہ اسے ابرِ رحمت سے دوبارہ زندگی یعنی نشو و نما کی قوت دے دیتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ قیامت کی گھڑی جب اللہ ہر جاندار کو موت سے دوچار کر دے گا یقیناً آنے والی ہے اور پھر اس کے بعد اللہ مُردوں کو زندہ کر کے حساب و کتاب کے لیے اٹھائے گا۔ ان مشاہدات کے بعد حیات بعد الموت، بعث اور معاد کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

مخبرِ صادقین نے قیامت کی خبر دی ہے

یہ حقیقت ہے کہ انبیائے کرام تمام لوگوں میں سب سے زیادہ سچے لوگ تھے اور ان کا کلام پوری انسانیت پر اللہ کی حجت ہے۔ ان تمام سچے نمائندگانِ خدا یعنی تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرامؑ نے متفقہ طور پر قیامت کی خبر دی ہے۔ پھر ان کے بعد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کے اوصیائے معصومین علیہم السلام نے جو قیامت تک کے لیے ہادیان صراط مستقیم ہیں یک زبان ہو کر بنی نوع انسان کو حیات بعد الموت اور یوم آخر کے بارے میں بار بار یہ بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ ان تمام صادق ترین بندگان خدا میں سے ہر ایک کا قول اپنے مقام پر حجت ہے تو وہ بات جسے وہ سب مل کر کہتے ہیں، وہ کیونکر درست نہ ہوگی؟ پھر دنیا کے تمام اہل مذہب حیات بعد الموت اور یوم جزاء کا تصور بھی رکھتے ہیں۔

تاہم ان تمام دلیلوں کے باوجود کچھ لوگوں نے نظریہ معاد پر یہ کہہ کر اعتراض کیا ہے کہ "یہ تو معدوم کو واپس لانے کے مترادف ہے اور معدوم کو واپس نہیں لایا جا سکتا۔" حالانکہ وہ لوگ اپنے اس دعوے پر کوئی قطعی دلیل و برہان پیش نہیں کر سکتے۔ بلکہ صرف شبہات پیدا کرتے ہیں اور وہ شبہات تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ پس ان کے ذریعے اس ثابت شدہ نظریے کی تردید نہیں کی جا سکتی۔

محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے ایسے لوگوں کے جواب میں فرمایا ہے کہ "معاد، معدوم کو واپس لانا نہیں ہے، بلکہ یہ تو متفرقات کو جمع کرنا ہے۔" مذکورہ جواب سے ان کی مراد یہ ہے کہ موت کے بعد جسم انسانی کے اجزا بکھر جاتے ہیں اور دوبارہ ان کو جمع کر کے زندہ کر دینا معاد ہے۔

مشاہدہ سب سے بڑی دلیل ہے

انسان اگر خود اپنی خلقت کے بارے میں غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے اجزائے بدن متفرق و منتشر تھے۔ کچھ مٹی کا حصہ تھے، کچھ پانی اور ہوا کا۔ پھر قادر حکیم نے ان اجزاء کو غلے، سبزیوں اور حیوانات کی شکل میں نمودار کیا۔ یہ ماکولات اس کے والد کے معدے میں داخل ہوئے جہاں

سے وہ منی کی شکل میں اس کے صلب میں پہنچے۔ پھر وہ منی رحمِ مادر میں منتقل ہوئی جہاں اسے مناسب مقام میں ٹھہرنا نصیب ہوا اور پھر وہ انسانی وجود پاکر ظاہر ہوا۔ خروجِ منی کے بعد تمام جسم کو غسلِ جنابت کے طور پہ دھونا اسی لیے واجب قرار دیا گیا ہے کہ وہ تمام اجزائے بدن کا خلاصہ ہے۔

بہرحال انسان ابتدائے خلقت سے روح کے داخل ہونے کی منزل تک دو مرتبہ اس عمل سے گزرتا ہے کہ متفرق اجزا سمٹتے ہیں اور اس کی تکوین ہوتی ہے۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب مٹی پانی اور ہوا کے اجزا جمع ہوتے ہیں اسی لیے اللہ نے فرمایا: "ہم نے تم لوگوں کو مٹی سے پیدا کیا۔" (سورۂ حج۔ آیت ۵) پھر دوسری مرتبہ اس وقت جب اس کے باپ کا نطفہ اس کی ماں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان حقیقتوں کے پیشِ نظر اس بارے میں کسی شبہے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ خالقِ حقیقی جسمِ انسانی کے متفرق اجزاء کو تیسری مرتبہ بھی جمع کر کے زندہ کر سکتا ہے۔ جبکہ وہ موت کی وجہ سے منتشر ہو چکے ہوں گے۔

پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"پہلی خلقت کے بارے میں تو تم جانتے ہی ہو تو پھر اس سے سبق کیوں نہیں لیتے؟" (سورۂ واقعہ۔ آیت ۶۲)

مقصد یہ ہے کہ نطفہ و علقہ و مضغہ کی شکلوں میں تخلیقِ بشر کے مراتب سے تو تم واقف ہی ہو۔ لہٰذا یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس خالقِ عالم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا وہ موت کے بعد دوبارہ بھی تمہیں پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی مثالیں زمین کی خشکی و ویرانی اور پھر زندگی و شادابی سے پورے طور پر ملتی ہیں۔

علاوہ ازیں حیاتِ دنیوی میں مُردوں کو زندہ کردینے کا معجزہ بھی رونما ہوتا رہا۔ مثلاً حضرت عیسیٰ مسیحؑ اور ان کے بعد سیدالانبیاؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے ہاتھوں مردے زندہ ہوتے رہے۔

قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے ایک نبی (بنا بر مشہور حضرت عزیرؑ) کا قصہ یوں بیان کیا گیا ہے:

جب وہ ایک تباہ شدہ گاؤں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا: "اللہ اس گاؤں (یعنی وہاں کے لوگوں) کو موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟" پس اللہ نے ان کو بھی موت دے دی۔ پھر انہیں زندہ کرکے اٹھایا اور پوچھا: "تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے؟" انہوں نے کہا: "ایک یا آدھے دن۔" (اللہ نے) کہا: "(نہیں) بلکہ تم یہاں سو سال پڑے رہے۔ پس دیکھو اپنے کھانے پانی کو کہ وہ خراب نہیں ہوئے اور اپنے گدھے کو دیکھو تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشانی بنادیں؛ تو دیکھو (گدھے کی) ہڈیوں کی طرف کہ ہم کیسے ان کو زندہ کرتے ہیں اور ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ - آیت ۲۵۹)

یہ نبی اپنے گدھے پر اپنا سامان سفر لیے ہوئے کہیں جارہے تھے۔ اتفاقاً ان کا گزر ایک ایسے قریہ کے پاس سے ہوا جو تباہ ہوچکا تھا۔ اس کے مکانات اپنی چھتوں سمیت گرے پڑے تھے اور وہاں کے باشندوں کی لاشیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ اس ہولناک منظر کو دیکھ کر انہوں نے اللہ کی قدرت کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "اللہ

انہیں موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟"

یہ جملہ اظہارِ عظمت کے لیے تھا، کیونکہ وہ نبی معصوم تھے۔ بہرحال اللہ نے ان کو وہیں موت دے دی، وہ سو سال تک وہیں پڑے رہے۔ جبکہ ان کا گدھا وہیں مر کر خاک ہو گیا۔ پھر سو سال بعد جب اللہ نے ان کو دوبارہ زندہ کیا تو پوچھا: "تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے؟" انھیں خیال آیا کہ شاید ایک دن یا آدھے دن وہ وہاں رہے۔ مگر پروردگار نے انہیں بتایا "تم یہاں سو سال تک پڑے رہے۔" پھر اللہ نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانے کے لیے ان سے کہا: "اپنے کھانے پینے کی چیزیں دیکھو کہ وہ اب بھی خراب نہیں ہوئیں۔" پھر ان کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ واقعی وہاں سو سال تک پڑے رہے۔ اللہ نے فرمایا: "ذرا اپنے گدھے کو تو دیکھو۔" وہ مر چکا تھا اور اس کی ہڈیاں گل سڑ گئی تھیں۔ تب اللہ نے ان کی نگاہوں کے سامنے اسے دوبارہ زندہ کیا۔ تاکہ انھیں اور دوسرے تمام لوگوں کو یقین آجائے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

اس معجزے میں دو متضاد باتوں کا اظہار ہوا ہے۔ پہلی بات عام قانونِ فطرت کے مطابق تھی یعنی گدھے کا مر جانا اور دوسری بات عام قانونِ فطرت کے خلاف تھی۔ یعنی کھانے پینے کی چیزوں کا اپنے حال پر باقی رہنا!

ابراہیمؑ کے لیے مُردوں کا زندہ ہونا

قرآن مجید اسی قسم کا ایک اور واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا تھا: "میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تو کیسے مُردوں کو زندہ کردیتا

ہے۔" (سورۂ بقرہ-آیت ۲۶۰)

تفسیر قمی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمندر کے کنارے ایک مُردہ جانور کو دیکھا جسے دوسرے گوشت خور جانور کھا رہے تھے۔ پھر ان میں سے بعض نے بعض پر حملہ کیا اور ایک دوسرے کو کھا گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تعجب ہوا اور کہا: "پروردگارا! مجھے دکھا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟"

پروردگار نے فرمایا: "کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں؟"

حضرت ابراہیمؑ نے عرض کی: "ایمان تو ہے، مگر میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آنکھوں دیکھ کر میرے دل کو اطمینان نصیب ہو۔"

حکم ہوا: "تم چار پرندوں کو لے لو اور ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو ایک دوسرے میں ملا دو۔ پھر تھوڑا تھوڑا گوشت پہاڑوں پر رکھ دو اور انہیں اپنی طرف بلاؤ تو دوڑے ہوئے آئیں گے۔ یقین کرو کہ اللہ عزیز و حکیم ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مور، ایک مُرغ، ایک کبوتر اور ایک کوّا[1] لیا۔ ان کو ذبح کیا اور ان کے گوشتوں کو ملا کر دس پہاڑوں پر تھوڑا تھوڑا رکھ دیا۔ پھر ان کو بلایا اور کہا: "زندہ ہو جاؤ

---

[1] بعض علماء نے کہا ہے کہ ان چاروں پرندوں میں سے انسان کی چار صفتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ مور سے خود پسندی اور اظہار زینت کا۔ مرغ سے شہوت پرستی کا۔ کبوتر سے لہو و لعب کا اور کوّے سے حرص و آرزومندی کا۔ (تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۲۲۷)

اللہ کے اذن سے۔" بس یہ کہنا تھا کہ ہر پرندے کا گوشت دوسرے سے الگ ہو کر یکجا ہونے لگا اور سب زندہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔ تب انہوں نے کہا: "یقیناً اللہ عزیز و حکیم ہے۔" [1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیفیتِ احیاءِ اموات دیکھنے کا جو سوال کیا تھا وہ واقعہ مذکورہ کے بعد ان کے تعجب کی بنا پر تھا، اس لیے نہیں کہ وہ کوئی مشاہداتی ثبوت طلب کر رہے تھے۔ کیونکہ انبیاءِ کرامؑ کا مقام ایسے مطالبات سے بلند ہوتا ہے۔ ان کا تعجب اس خیال سے ہو سکتا تھا کہ اگر کسی انسان کو کوئی درندہ کھا لے اور اس درندے کو کوئی دوسرا درندہ کھا لے تو پھر انسان کیسے زندہ ہوگا۔ لہٰذا اللہ نے ان کے تعجب کو رفع کر دیا [2] اور ظاہر کر دیا کہ مُردوں کو زندہ

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۲ صفحہ ۳۷۹

[2] کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں محمد ابن جہم سے روایت ہے کہ وہ مامون کے دربار میں بیٹھا تھا اور امام علی رضا علیہ السلام بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ مامون نے امامؑ سے پوچھا: "فرزندِ رسولؐ! کیا آپ کا یہ قول نہیں ہے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں؟" امامؑ نے فرمایا: "یقیناً ہے۔" مامون نے امامؑ سے چند آیات کے بارے میں پوچھا، اسی سلسلے میں اس نے کہا: "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو مُردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت دیکھنا چاہی، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟" امامؑ نے فرمایا: اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف وحی کی تھی کہ "میں ایک بندے کو خلیل بنانے والا ہوں۔ اگر وہ احیاءِ موتیٰ کا بھی سوال کرے گا تو قبول کروں گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ بات القاء ہوئی کہ

کرنے سے کہیں زیادہ تعجب خیز آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ہے۔ اسی امر کی جانب اللہ نے سورۂ غافر کی ۵۷ ویں آیت میں اشارہ فرمایا ہے اور کہا ہے کہ جو افلاک و زمین کو پیدا کرسکتا ہو اس کے لیے انسان کو اس کی موت کے بعد زندہ کردینا کیا مشکل ہے؟ پروردگار فرماتا ہے:

"کیا وہ خالق جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں کہ ان کے مثل پیدا کردے۔ یقیناً وہی خلاق و علیم ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے "ہوجا" اور وہ ہوجاتی ہے"۔ [1]

قیامتِ کبریٰ

جہاں تک اس قیامت کے وقت کا تعلق ہے تو اسے اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ قرآن مجید میں ہے:

"یقیناً اللہ ہی کے پاس ساعتِ قیامت کا علم ہے"۔

(سورۂ لقمان۔ آیت ۳۴)

البتہ اللہ نے سیدالانبیاءؐ اور ان کے اوصیاء معصومین علیہم السلام کو اس کا علم دیا ہے، لیکن انہیں اس کے اظہار کا حکم نہیں ہے۔ جیسے انھوں نے بعض مصلحتوں کے تحت بہت سے دوسرے علوم کو چھپائے رکھا، اسی طرح اسے بھی چھپائے رکھا۔ پس لوگ اس حالت پر رہیں گے کہ کچھ مرچکے ہوں گے، کچھ زندہ ہوں گے کہ اللہ اس دنیا کو اس کے

وہی خلیل خدا ہیں۔ لہٰذا اس اطمینان کے لیے وہ سوال کیا کہ میں واقعی خلیل ہوں یا نہیں۔ (تفسیر المیزان جلد ۲ صفحہ ۴۰۲) [1] سورۂ یٰسٓ۔ آیت ۸۱۔۸۲)

رہنے والوں سمیت فنا کر دینے کا حکم دے گا۔

علامات و شرائطِ قیامت

پروردگارِ عالم نے کچھ حوادث و واقعات کو قربِ قیامت کی علامت اور قرینہ قرار دیا ہے۔ ان میں سے کچھ قیامت سے پہلے واقع ہوں گے، کچھ دوبارہ زندہ کیے جانے کے وقت ہوں گے اور کچھ دوبارہ زندگی کے بعد ظاہر ہوں گے۔ ان سب کو اشراطِ ساعت کہتے ہیں۔ یہ نہایت ہولناک حادثات ہوں گے جن سے یوم النشور اور اس کی ہولناکی اور سختی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے چند حادثات کا ذکر آیاتِ قرآن اور احادیثِ اہلبیتؑ کی روشنی میں ہم پیش کرتے ہیں۔

رجعت

"کفایۃ الموحدین" (حصۂ سوم) کے مطابق رجعت علاماتِ قیامت میں سے ایک اہم واقعہ ہوگا۔ شیخ مفید علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

"میں کہتا ہوں (یعنی میرا عقیدہ ہے) کہ اللہ تعالیٰ قیامت سے پہلے کچھ مرے ہوئے لوگوں کو اسی دنیا میں ان کی سابقہ صورتوں میں ایک بار پھر زندہ کرے گا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو عزت عطا فرمائے گا اور کچھ کو ذلیل و خوار کرے گا۔ حق پرستوں کو باطل پرستوں سے اور مظلوموں کو ظالموں سے ان کے حقوق دلوائے گا۔ یہ سب کچھ قائم و مہدیِ آلِ محمد علیہ وعلیہم السلام کے ظہور و قیام کے وقت ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ دنیاوی زندگی کی طرف اس موقع پر پلٹنے والے گروہ دو قسم کے ہوں گے۔ ایک گروہ وہ ہوگا جو اپنی پہلی زندگی میں ایمان و عملِ صالح کے اعلیٰ درجوں پر فائز ہوگا اور دنیا سے گناہانِ کبیرہ کے بغیر رخصت ہوا ہوگا۔ اللہ ان لوگوں

کو دولتِ حق کی شان و شوکت دکھائے گا اور ان کی وہ آرزوئیں پوری کریگا جو وہ دنیا میں چاہتے تھے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو ظلم و فساد کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہونگے اور انہوں نے اولیاء اللہ پر مظالم ڈھائے ہوں گے۔ پروردگار عالم ایسے ظالموں سے اس دنیا میں بھی انتقام لے گا اور مظلوموں کی دادرسی کرے گا۔ پھر یہ دونوں گروہ دوسری مرتبہ موت سے دوچار ہوں گے اور اس کے بعد تمام دوسرے لوگوں کے ساتھ حشر و نشر کے لیے اٹھائے جائیں گے اور ثواب و عقاب میں جس کے مستحق ہوں گے وہ انھیں ہمیشہ کے لیے دیا جائے گا۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس پر مذہب امامیہ کے تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ سوائے ان شاذ و نادر لوگوں کے جنہوں نے اس کے برخلاف تاویل کی ہے۔[1]

مذہب امامیہ کے نزدیک رجعت صرف ان لوگوں کے لیے ہوگی جو خالص الایمان یا خالص الکفر ہوں گے۔ باقی لوگوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ بہرحال عقیدۂ رجعت مذہب امامیہ میں ضروریاتِ مذہب میں سے ہے۔ اس کی حقانیت پر اجماعِ مذہب کے علاوہ کتاب و سنت کی دلیلیں بھی موجود ہیں۔

مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اس دن جب ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کو جمع کریں گے جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے تھے۔" (سورۂ نمل۔ آیت ۸۳)

---

[1] اوائل المقالات صفحہ ۵۱، از شیخ مفید نور اللہ مرقدہٗ۔

یہ آیت کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ خاص لوگوں کا حشر ہوگا۔ لہٰذا یہ اس حشرِ اکبر سے پہلے ہوگا جو بروزِ قیامت ہوگا۔ تفسیر قمی میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے راویٔ حدیث سے فرمایا: "لوگ اس آیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا: "لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ قیامت کا دن ہوگا۔" امامؑ نے فرمایا: "کیا اللہ قیامت کے دن صرف ایک گروہ کو محشور کرے گا اور باقیوں کو چھوڑ دے گا؟" ایسا نہیں ہے بلکہ یہ حشر رجعت کے موقع پر ہوگا۔ قیامت کے بارے میں تو اللہ یہ فرماتا ہے:

"اور ہم نے ان سب کو جمع کیا تو ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑا۔" (سورۂ کہف - آیت ۴۷)

اسی طرح یہ آیتِ قرآنیہ بھی دلیل رجعت ہے:

(وہ لوگ کہیں گے) "ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندگی دی۔ پس ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں تو کیا نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟" (سورۂ غافر - آیت ۱۱)

تفسیر قمی میں امام جعفر صادقؑ علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "یہ رجعت میں ہوگا۔ یعنی ایک مرتبہ زندہ کرنا رجعت میں اور دوسری مرتبہ زندہ کرنا قیامت میں ہوگا۔ اسی طرح ایک مرتبہ موت، حیاتِ دنیوی میں آئے گی اور دوسری مرتبہ رجعت کی زندگی میں۔"

نیز خدا کا یہ قول بھی دلیلِ رجعت ہے:

"اور یقیناً ہم انھیں عذابِ اکبر سے پہلے عذابِ کمتر

کا مزہ چکھائیں گے تاکہ وہ پلٹیں۔"

(سورۂ سجدہ۔ آیت ۲۱)

تفسیر قمی میں اس آیت کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "عذاب کمتر سے مراد عالم رجعت میں تلوار کا عذاب ہے اور عذاب اکبر قیامت کا عذاب ہے اور ان کے پلٹنے سے مراد عالم رجعت میں ان کا پلٹنا ہے۔"

ان کے علاوہ دوسری آیات اور احادیث بھی ہیں ــــ جن کو بحار الانوار جلد ۵۳ صفحہ ۳۹ تا ۱۴۴ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مسئلہ رجعت ان مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں اسلام کے ابتدائی دور سے اب تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ شیعوں نے اسے تسلیم کیا ہے جبکہ ان کے مخالفین نے اس کا انکار کیا ہے۔ شیعوں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں کتاب و سنت سے اسے ثابت کیا ہے اور منکرین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ان کتابوں کی نشاندہی ہمارے موضوع کلام سے خارج ہے۔ اسی طرح جیسے اس مسئلے کی تفصیلی دلیلوں کا پیش کرنا خارج از گفتگو ہے۔ تاہم چونکہ سب سے بڑا شبہہ جسے مخالفین پیش کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ رجعت کا وقوع بعید از قیاس ہے۔ لہٰذا ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں پر بعض فضلاء کا وہ کلام پیش کر دیں جسے انہوں نے شیخ عاملی اعلی اللہ مقامہ کی کتاب "الایقاظ من الہجعۃ" (یعنی نیند سے جگانا) کے شروع میں بطور مقدمہ لکھا ہے۔ اس سے تمام شبہات انشاء اللہ زائل ہو جائیں گے۔ ملاحظہ ہو:

قرآن مجید بہت سی آیتوں میں اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ روح و حقیقتِ دین پروردگارِ عالم کی بارگاہ میں تسلیم و سپردگی کا نام ہے اور اسی حقیقت کی تعبیر کبھی لفظِ اسلام سے اور کبھی لفظ تسلیم سے کی جاتی ہے۔

پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہے۔"

(سورۂ آل عمران - آیت ۱۹)

پھر فرماتا ہے:

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"

(سورۂ آل عمران - آیت ۸۵)

اور فرمایا:

"ہاں، جو اپنا سر جھکا دے اللہ کے سامنے اور وہ نیکوکار بھی ہو تو اس کا اجر اس کے پروردگار کے پاس ہے۔ ایسے لوگوں پر نہ کوئی خوف طاری ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

(سورۂ بقرہ - آیت ۱۱۲)

نیز فرمایا:

"پس نہیں، تمہارے رب کی قسم یہ اہل ایمان نہیں بن سکتے، جب تک یہ آپ کو (اے پیغمبرؐ) حاکم اور ثالث نہ تسلیم کرلیں۔ ہر اس نزاع میں جو ان کے درمیان رونما ہو۔ پھر یہ اپنے دلوں میں اس فیصلہ کے بارے میں جو آپ

کردیں کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں جو تسلیم و سپردگی کا حق ہے۔" (سورۂ نساء - آیت ۶۵)

اس حقیقت کے مختلف مظاہر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو کچھ بذریعہ وحی آیا ہے اسے تسلیم کیا جائے۔ یعنی جو احکام و قوانین یا اخبار اور واقعات اللہ کی کتاب میں یا نبی و امامِ معصوم کی زبان سے بیان ہوئے ان سب کو مان لیا جائے۔ نبی و امام معصوم چونکہ عبد و معبود کے درمیان وسیلہ و رابطہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے احکام و اقوال کو تسلیم کرنا گویا اللہ جل شانہٗ کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا ہے۔

تاہم وحیِ الٰہی کے ذریعے کچھ ایسے امور بھی ہم تک نبی و امام معصوم کے وسیلے سے پہنچے ہیں جن کے ادراک سے ہماری عقلیں عاجز ہیں اور یہیں سے شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ پس کچھ لوگ تو اپنی نافہمی کی بنا پر ان امور سے انکار کر دیتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو احتیاط کا راستہ اختیار کرتے ہیں، وہ ایسے امور کے بارے میں تاویل و توجیہہ سے کام لیتے ہیں۔ معادِ جسمانی، معجزات، شفاعت اور غیبتِ امام زمانہ ایسے ہی امور میں داخل ہیں۔

ان مذکورہ دونوں فریقوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو عقل و فکر کے اعتبار سے زیادہ مستحکم ہے اور راہِ تسلیم میں زیادہ پائیدار ہے۔ یہ لوگ اپنی عقل کو اس کی طبعی قوت سے زیادہ جولانی نہیں دیتے بلکہ واضح طور پر یہ اعتراف کر لیتے ہیں کہ ایسے امور کی حقیقت کا ادراک کرنے سے ان کی عقل عاجز ہے۔ لہٰذا وہ دینی مسلمات کا نہ انکار کرتے ہیں نہ توجیہہ تاویل کی راہ ڈھونڈتے ہیں بلکہ فرموداتِ خدا اور ارشاداتِ نبی و امام معصوم پر تسلیم و سپردگی کے انداز میں ایمان لاتے ہیں۔ ان کا اندازِ فکر

مشابہت رکھتا ہے ان "راسخون فی العلم" کے انداز فکر سے جن کے بارے میں پروردگار عالم فرماتا ہے:

"اور علم میں مضبوطی سے قائم رہنے والے کہتے ہیں ہم اس پر بھی ایمان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے' اور نہیں عبرت حاصل کرتے مگر وہ جو صاحبان عقل ہیں۔"

(سورۂ آل عمران - آیت ۷)

ان دونوں حیثیتوں (یعنی انسانی عقل کا محدود ہونا اور اللہ و رسولؐ و امام معصومؑ کے ارشادات کا حق ہونا) کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آخرالذکر قسم کے لوگ واقعی صحیح فکر رکھنے والے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یوں سمجھی جا سکتی ہے کہ انسان تنہا اپنی عقل کی مدد سے جو علم حاصل کرتا ہے اسے آخری حقیقت کا علم نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً کبھی یہ نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور مرکزِ عالم ہے' جس پر سات آسمان تہ بہ تہ پیاز کے چھلکوں کی طرح جمے ہوئے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ زمین نہ ساکن ہے نہ مرکزِ عالم ہے۔ بلکہ وہ تو خود آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے اور یہ کہ افلاک کا پرانا تصور بھی غلط ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان جس قدر اپنے علم میں اضافہ کرتا جاتا ہے' اسی قدر اسے اپنے جہل کا اعتراف زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ عماد اصفہانی متوفی ۵۹۷ھ کا مقولہ ہے:

"میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ انسان اگر آج کوئی کتاب لکھتا ہے تو کل اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو بہتر ہوتا۔ اسی طرح جتنا وقت گزرتا جاتا ہے اس کے نظریات میں فرق آتا جاتا ہے۔ یہ عقلِ بشری

ناتمامیت اور اس کے نقص کی واضح دلیل ہے"۔

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں۔ بلکہ جس قدر بھی اس کی معرفت حاصل کی جائے اسی قدر اس کی عظمت وجلالت کے لامحدود ہونے کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری عقلیں اس ذات لامحدود کا ادراک کرنے سے یکسر قاصر ہیں۔

ان دونوں حقیقتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ارشادات ربانی کے سامنے سر تسلیم خم کردینا ہی بہترین طریق کار ہے۔ نہ یہ کہ محض اس بنا پہ کسی چیز سے انکار کیا جائے کہ اس کے ادراک سے ہماری عقل قاصر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عام انسانوں ہی میں سے اگر کوئی شخص علم و تحقیق میں اس مرتبے تک پہنچ جائے کہ لوگ اس کے مقام علمی کا اعتراف کرنے لگیں تو اگر وہ کوئی ایسی بات کہہ دے جسے عام انسان اپنی عقل سے نہ سمجھ سکے یا اسے بعید از عقل سمجھتا ہو تب بھی لوگ اس کی بات کی تصدیق کرتے ہیں اور اسے نہ سمجھنے کو اپنی عقل کا قصور قرار دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی سائنسدان ایسی بات کہے جو عام انسان کی سمجھ سے باہر ہو تو اس کے باوجود اس کی بات کو درست قرار دیا جاتا ہے اور انکار کرنے والے کو پاگل کہا جاتا ہے کیونکہ عام لوگ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ سائنس دان ان سے زیادہ عقل و فہم رکھنے والا ہے۔

لہٰذا وہ حضرات جو وحی ربانی اور الہام خداوندی کے حوالے سے کوئی بات کہتے ہیں ان کی باتوں کا انکار محض اس بہانے سے کیونکر کیا جاسکتا ہے کہ وہ انکار کرنے والوں کے نزدیک بعید از عقل ہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں جن کو کچھ دن پہلے ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ آج

وہ ممکن ہی نہیں بلکہ روزمرہ کا معمول بن چکی ہیں؟ اسی طرح کچھ چیزیں آج سے پہلے صحیح سمجھی جاتی تھیں۔ مگر اب ان کا غلط ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

پس جب ہم انسانوں کا یہ حال ہے کہ ہم اپنے ہی جیسے انسانوں میں سے علم و تحقیق کے مرتبے تک پہنچنے والوں کی ان باتوں کی بھی تصدیق کرتے ہیں جو خود ہماری عقل میں نہیں آتیں اور ایسے موقعوں پر ہم خود اپنی عقل کا قصور تسلیم کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جس طرح خود ہم سے غلطی و غفلت ہو سکتی ہے، اسی طرح ماہرین علم و تحقیق سے بھی غلطی و غفلت ممکن ہے تو ہم ان حضرات کی باتوں کو کیسے تسلیم نہ کریں جو خالق علم و قدرت اور موجد عقل و خرد صانع عالم کی وحی و الہام کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں؟ صفحات کائنات میں کتنے ہی ایسے صفحات ہیں جنہیں انسان نے ابھی تک نہیں پڑھا اور کتنے ہی ایسے اسرار و رموز ہیں جو ابھی تک انسان کے لیے منکشف نہیں ہوئے۔ کیا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے؟ وحی الٰہی بھی تو یہی کہتی ہے۔

آج کا انسان ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے اور حقائق حیات و کائنات کو سمجھنے میں سرگرداں ہے۔ پس اگر دینی اعتبار سے کسی برگزیدہ انسان کی نہایت طولانی عمر کو تسلیم کیا جاتا ہے تو اسے محض بعید از عقل سمجھتے ہوئے کیسے رد کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ کسی انکشافِ علمی ہی کے ذریعے اس طولِ حیات کا راز بھی سمجھ میں آنے کے قابل ہو جائے۔

آج اگر یہ کہہ دیا جائے کہ کسی ماہر طبیعیات نے موت کی دوا ایجاد کر لی ہے تو یقیناً ہم میں سے بہت سے لوگ اس کی تصدیق کے لیے فوراً

تیار ہو جائیں گے۔ مگر جب یہ کہا جائے کہ اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق ایک ہادی و مصلح عالم کو ہماری بقا اور قیامت کے دن ہماری نجات کے لیے باقی رکھا ہے اور انھیں مناسب وقت پر اس دنیا میں ظاہر کرے گا تو اس بات پر بہت سے لوگ شک و شبہے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر انکار یا خواہ مخواہ کی توجیہ و تاویل سے کیوں کام لیا جاتا ہے؟ اور ایسے مسائل میں ہر ایک یہ کوشش کیوں کرنا چاہتا ہے کہ وہ ہر جزئی تفصیل کو خود اپنی عقل و فہم سے پورے طور پر سمجھ لے؟ کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم اپنی عقل و فہم کے قصور کو تسلیم کرتے ہوئے اللہ کے وعدے پر یقین رکھیں اور اس کے پورے ہونے کا انتظار کریں؟

کم از کم ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ ایسے دینی امور اور اسرار الٰہیہ کے بارے میں سر تسلیم خم کرتے ہوئے یقین کر لینا ہی عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ خصوصاً وہ دینی امور جن کا تعلق عالم آخرت سے ہے اور ان کو پورے طور پر سمجھنا وحی ربانی کے سوا عقلِ بشری کی جولاں گاہ سے پرے ہے۔

آج کی روشن خیال دنیا میں بھی بے شمار اسرار کائنات ایسے ہیں جن تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتی ہے تو عالم آخرت کے رموز اور پھر ان کی جزئیات کو سمجھنے پر اصرار کرنا کیسے اور کہاں تک معقول ہو سکتا ہے؟

وہ آخرت اور رجعت کا نظریہ ہو یا غیبتِ امام کا مسئلہ منکرین کی ساری قیل و قال درحقیقت اسی استدلال پر آج بھی مبنی ہے، جسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ابی ابن خلف نے ایک بوسیدہ ہڈی کو پیش کر کے، بزعم خود قرآن مجید کو جھٹلانے کی جاہلانہ کوشش کی تھی۔ آج کے ترقی یافتہ دور کے لوگ بھی اسی طرح مذکورہ حقیقتوں کو

بعید از عقل کہہ کر رد کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح جاہلیت کے اس نمائندے نے انسان کے دوبارہ زندہ کیے جانے کو بعید از عقل قرار دیا تھا۔

حالانکہ یہ بعید از عقل ہونے کا کمزور استدلال جس طرح اس وقت باطل تھا اسی طرح آج بھی باطل ہے۔ کیونکہ یہ خلاق عالم اور اسکی بے اندازہ قدرت وحکمت سے انکار یا اس کے بارے میں ضعفِ یقین پر مبنی ہے۔

ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

"پس اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں تو تم یقین سے جان لو کہ جو کچھ نازل کیا گیا وہ اللہ کے علم سے ہے اور اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں ہے، تو کیا تم تسلیم کرنیوالے ہو؟"

(سورۂ ہودؑ۔ آیت ۱۴)

یاجوج وماجوج

علامات قیامت میں سے یاجوج وماجوج کا ظاہر ہونا بھی ہے۔

پروردگار عالم فرماتا ہے:

"ان لوگوں نے کہا: اے ذوالقرنین، یقیناً یاجوج وماجوج زمین میں فساد برپا کرنے والے ہیں۔ پس اگر ہم آپ کے لیے خرچ مہیا کر دیں تو کیا آپ ہمارے اور ان کے درمیان دیوار بنا دیں گے؟" (سورہ کہف۔ آیت ۹۴)

پروردگار نے دیوار بننے اور یاجوج وماجوج کے اس میں سوراخ کر کے دوسری طرف آجانے سے عاجزی کا ذکر کرنے کے بعد ذوالقرنین کا یہ قول نقل کیا ہے:

"یہ میرے پروردگار کی طرف سے رحمت ہے۔ مگر جب

وعدۂ پروردگار کا وقت آئے گا تو وہ اسے کمزور کردے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ حق ہے۔"

(سورۂ کہف - آیت ۹۸)

اور ارشاد خداوندی ہے:

"یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے اتر رہے ہوں گے اور وعدۂ حق قریب آچکا ہوگا تو اس وقت ان لوگوں کی آنکھیں چڑھ جائیں گی جنہوں نے کفر کیا ہوگا۔"

(سورۂ انبیاءؑ - آیت ۹۷)

کچھ اور علامتیں

علامات قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا، دابۃ، دجال اور دھواں یہ سب ظاہر ہوں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

"یا یہ کہ آئیں آپ کے پروردگار کی کچھ نشانیاں۔ وہ دن جب آپ کے پروردگار کی کچھ نشانیاں آچکیں گی تو وہ نفس جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہوگا۔ اسے اس دن ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دے گا۔" (سورہ انعام - آیت ۱۵۸)

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ "نشانیوں سے مراد چوپایہ کا ظاہر ہونا یا آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: چھ چیزوں کی آمد سے پہلے ہی نیک اعمال کی طرف جلدی کیا کرو:

۱ــــ آفتاب کا مغرب سے نکلنا۔

۲ــــ دابّہ کا نکلنا

۳ــــ دجال کا ظاہر ہونا

۴ــــ دھوئیں کا آنا

۵ــــ تمہاری اپنی موت

۶ــــ قیامت [1]

آسمان سے ظاہر بظاہر دھواں نکلے گا (سورۂ دخان۔ آیت ۱۰) اس آیت کی رو سے بعض مفسرین دھوئیں کو بھی قیامت کی علامتوں میں شمار کرتے ہیں۔ حذیفہ بن اُسید سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک دفعہ رسول اللہؐ اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے، جبکہ ہم لوگ قیامت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا: دس چیزوں کی آمد سے پہلے قیامت نہیں آئے گی۔

۱۔ دجال ۲۔ دھواں ۳۔ سورج کا مغرب سے نکلنا ۴۔ دابۃ الارض ۵۔ یاجوج وماجوج ۶۔ زمین مشرق کا دھنس جانا ۷۔ زمین مغرب کا دھنس جانا ۸۔ جزیرہ عرب کا دھنس جانا ۹۔ عدن سے ایک آگ کا نکلنا جو لوگوں کو اس طرح ہنکائے گی کہ جب وہ چلیں گے تو چل

---

[1] اسی مجمع البیان میں ہے کہ "وہ دن جب ایسی نشانیاں ظاہر ہو جائیں جو معرفتِ حق کی طرف مجبور کردیں اور احکامِ الٰہی پر عمل کرنے کی تکلیف کا وقت ختم ہو جائے تو کسی کو اس دن کا ایمان کوئی نفع نہیں پہنچائے گا۔ اگر پہلے سے ایمان نہ لایا ہو" (جلد ۲ صفحہ ۳۸۸)

پڑے گی اور جب وہ رکیں گے تو رک جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ ان کو میدان حشر میں لے آئے گی ۱۰۔ نزول عیسیٰؑ کو غالباً راوی نے اس کو سہواً ترک کر دیا ہے۔ (بحار الانوار جلد۶ صفحہ ۳۰۳)

حذیفہ بن اُسید ہی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے حضرت رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: قیامت برپا ہونے سے پہلے دس نشانیاں نمودار ہوں گی۔ ان میں سے پانچ مشرق اور پانچ مغرب میں ظاہر ہوں گی۔ پھر ساری نشانیاں حدیث میں مذکور نہیں ہوئیں اور صرف دابہ، دجال، سورج کے مغرب سے نکلنے، نزول عیسیٰؑ اور ان کے یاجوج وماجوج کو مغلوب کرنے اور سمندر میں غرق کر دینے کا ذکر آیا ہے۔

(بحار الانوار جلد۶ صفحہ ۳۰۳)

حذیفہ ابن اسید غفاری سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ایک دفعہ ہم لوگ مدینہ میں کسی دیوار کے سائے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور حضور اقدسؐ ایک حجرے میں آرام فرما رہے تھے۔ جب حضورؐ ہمارے پاس تشریف لائے تو پوچھا: "تم کس چیز کے متعلق بات کر رہے تھے؟" ہم لوگوں نے عرض کیا: "ہم قیامت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔" حضورؐ نے فرمایا: "جب تک دس علامات نمودار نہیں ہوں گی قیامت نہیں آئے گی اور وہ یہ ہیں: سورج کا مغرب سے نکلنا۔ دجال۔ دابۃ الارض۔ زمین مشرق کا دھنس جانا۔ زمین مغرب کا دھنس جانا۔ جزیرہ عرب کا دھنس جانا۔ عیسیٰؑ ابن مریمؑ کا نزول۔ یاجوج وماجوج کا نکلنا۔ آخر میں یمن سے ایک آگ نکلے گی اور لوگوں کو میدان حشر کی طرف اس طرح

ہنکائے گی کہ وہ رکیں گے تو رک جائے گی اور چلیں گے تو چل پڑے گی۔
آسمان سے دھوآں نکلنا۔ (غالباً راوی نے اس کو سہواً ترک کر دیا ہے)

نفخ صُور

نفخ صور سے مراد ہے خدا کی طرف سے صور کا پھونکا جانا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یہ لوگ نہیں انتظار کرتے مگر ایک نہایت شدید آواز کا جو انھیں آپکڑے گی۔ اس حال میں کہ وہ لڑ جھگڑ رہے ہوں گے۔ پس اس وقت نہ وہ کوئی وصیت کر سکیں گے نہ وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکیں گے"۔

(سورہ یٰسٓ۔ آیت ۴۹-۵۰)

تفسیر قمی میں ہے کہ "یہ آخری زمانے میں ہوگا کہ لوگوں کو ایک نہایت شدید چیخ (یا آواز) سنائی دے گی۔ اس حال میں کہ وہ اپنے بازاروں میں سودا بازی پر لڑ جھگڑ رہے ہوں گے۔ پس وہ سب کے سب وہیں اپنی جگہ پر مر جائیں گے اور کوئی نہ اپنے گھر لوٹ سکے گا، نہ کوئی وصیت کر سکے گا"۔
یہ صور پھونکے جانے یعنی شدید ترین آواز کا عمل دو دفعہ ہوگا۔ پہلی آواز پر ہر ذی رُوح مر جائے گا اور دوسری آواز تمام کے تمام کو زندہ کرے گی۔
شیخ جلیل القدر علی ابن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں امام زین العابدینؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "جہاں تک پہلی پھونک کا تعلق ہے تو اللہ جل شانہٗ اسرافیل کو حکم دے گا، وہ ایک صُور لیکر دنیا میں آئیں گے جس کا ایک سر اور دو رُخ ہوں گے اور دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ ہوگا۔ جب ملائکہ اسرافیل کو اس حال میں دیکھیں گے تو کہیں گے:

اللہ نے اہل ارض واہل سماء کی موت کا حکم دیا ہے۔"

اسرافیل بیت المقدس کے پاس اتریں گے اور قبلہ رو کھڑے ہوں گے اور اہل زمیں ان کو دیکھ کر کہیں گے: "اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی موت کا حکم دیدیا ہے۔" اسرافیل ایک پھونک ماریں گے جس سے صور کے زمین کی طرف والے رخ میں سے آواز پیدا ہوگی۔ پس زمین پر جتنے ذی روح ہوں گے وہ سب چیخ مار کر مر جائیں گے۔ پھر وہ دوسری مرتبہ پھونک ماریں گے تو اس رخ سے آواز بلند ہوگی جو آسمان کی طرف ہوگا۔ پس آسمان پر جتنے ذی رُوح ہونگے وہ سب چیخ مار کر مر جائیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ اسرافیل کو بھی حکم موت دے گا اور وہ بھی مر جائینگے۔ وہ سب اسی حال میں اتنے عرصے تک رہیں گے جب تک اللہ چاہے گا۔

پھر اللہ آسمانوں کو حکم دے گا تو وہ حرکت میں آئیں گے اور پہاڑوں کو حکم دے گا تو وہ چلنے لگیں گے۔ جیسا کہ قول ربانی ہے:

"جس دن آسمان حرکت کریں گے اور پہاڑ چلنے یعنی پھیلنے لگیں گے۔" (سورۂ طور۔ آیت ۹-۱۰)

پھر زمین بدل دی جائے گی۔ یعنی وہ ایسی زمین ہوگی جس پر گناہ نہ کیے گئے ہوں گے۔ وہ کھلی زمین جس پر نہ پہاڑ ہوں گے نہ سبزی، بلکہ ابتدائی شکل پر ہوگی اور اللہ کا عرش پہلے کی طرح پھر پانی پر ہوگا۔

اقتدار صرف خدائے واحد کا ہے

اسی موقع پر خدائے جبار و قہار ایسی بلند آواز میں جو زمین و آسمان کے ہر گوشے میں سنی جاسکے گی، صدا بلند کرے گا کہ "کہاں ہیں جبر و استبداد والے؟ کہاں ہیں حکومت و اقتدار والے؟ آج کس کا اقتدار ہے؟

اس آواز قدرت کا جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ تب خدائے جبار و قہار خود ہی جواب دے گا۔" اقتدار صرف اللہ کے لیے ہے جو ایک ہے اور قہار ہے۔ میں نے تمام مخلوقات کو قہراً موت دی ہے اور میں ہی وہ اللہ ہوں کہ نہیں ہے کوئی عبادت کے لائق میرے سوا، نہ کوئی میرا شریک ہے، نہ وزیر ہے۔ میں نے ہی اپنی مخلوقات کو پیدا کیا تھا۔ میں نے ہی اپنی مشیّت سے سب کو مار ڈالا ہے اور میں ہی اپنی قدرت سے ان سب کو زندہ کروں گا۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ" وہ خالقِ حقیقی فنائے مخلوقات کے بعد پھر تن تنہا رہ جائے گا۔ جیسے وہ تخلیق کائنات سے پہلے تھا۔ نہ کوئی وقت، نہ کوئی مکان، نہ آن نہ زمان، مدتیں اور اوقات، سال اور ساعات کچھ نہ ہوں گے یعنی اس واحدِ قہار کے سوا جس کی طرف تمام امور کی بازگشت ہے کچھ نہ ہوگا۔ اشیاء کی خلقت خود ان کی قدرت سے نہ تھی۔ لٰہذا وہ اپنے لیے فنا کو بھی نہ روک سکیں، کیونکہ اگر وہ فنا کو روکنے پر قادر ہوتیں تو ہمیشہ ہی باقی رہتیں۔"

پھر جہاں تک دوسری پھونک یعنی دوبارہ زندگی کی پھونک کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اور صُور پھونکی گئی تو وہ سب کے سب اپنی قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔"

(سورۂ یٰسٓ۔ آیت ۵۱)

علی ابن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:" خدائے جبار و قہار جب دوبارہ

صور پھونکے گا تو پہلے اس طرف سے آواز بلند ہو گی جو آسمان کی طرف ہو گی۔ اس آواز پر اہلِ سماوات میں سے ہر ایک زندہ ہو کر کھڑا ہو جائے گا۔ حاملینِ عرش کو پھر اٹھالیں گے اور جنت و جہنم سب پیش ہوں گے پھر دوسری تمام خلائق زندہ کر کے حساب کے لیے جمع کی جائیں گی۔"

راوی کہتا ہے کہ اس موقع پر میں نے امام علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ شدت سے رونے لگے۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ "پہلی اور دوسری نفخِ صور کے درمیان کتنا فاصلہ ہو گا؟" تو امامؑ نے فرمایا: "چالیس برس کا!"

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "میں کیونکر نعمتوں میں خوش ہو کر غافل ہو جاؤں! جب کہ صور پھونکنے والا اپنے منہ میں صور لیے تیار بیٹھا ہے اور سر جھکائے ہوئے حکمِ الٰہی پر کان لگائے ہے کہ کب اسے صور پھونکنے کا حکم ملتا ہے۔"

لوگوں نے کہا: "یا رسول اللہؐ! آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "یہ کہتے رہو، 'ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین وکیل ہے۔'"[2]

بعض دوسری روایات میں ہے کہ وہ عجیب واقعات جن کا ذکر ہو چکا یعنی زلزلے، آفتاب کا دھندلانا، سمندروں کا امنڈ پڑنا اور پہاڑوں

---

[1] سید جزائری: الانوار النعمانیہ صفحہ ۴۶۲-۴۶۳ طبع ہجری۔
[2] حوالۂ سابق۔

کا ریزہ ریزہ ہونا' یہ واقعات دونوں پھونکوں کے درمیان واقع ہوں گے۔
پھر چالیس دن تک تمام اقطارِ عالم میں شدید بارش ہوگی اور سب سے پہلے
اللہ جس کو زندہ کرے گا وہ اسرافیل ہوں گے۔ تب وہ دوسری مرتبہ
زندہ کرنے والا صُور پھونکیں گے اور جسموں سے جدا ہونے والی روحوں اور
ان کے متفرق اجزا سے وہ کہیں گے: "اے روحو، اے منتشر گوشت و پوست
اور اے ہڈیو! آؤ سب سمٹ کے آؤ حساب کے لیے۔"

تب اللہ جل شانہٗ زمین کو حکم دے گا کہ زلزلوں کے ذریعے جو کچھ
اس کے جوف میں ہے اسے نکال دے۔ ارشاد باری ہے:

"اور زمین نے اپنے بوجھ کو نکال دیا ہو گا۔"

(سورۂ زلزال۔ آیت ۲)

"جب صور پھونکی جائے گی تو سب کے سب اپنی قبروں
سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔"

(سورۂ یٰسٓ۔ آیت ۵۱)

خلاصۂ کلام یہ کہ متفرق و منتشر ذرات جمع ہوں گے اور ان میں
اذنِ خدا سے روح پھونکی جائے گی تو آنِ واحد میں تمام لوگ اپنی قبروں
سے نکل پڑیں گے۔ ارشاد باری ہے:

"نہیں ہے تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا اٹھانا، مگر ایک
سانس کی مانند۔" (سورۂ لقمان۔ آیت ۲۸)

اس وقت اہل ایمان فرحت و مسرت میں ہوں گے اور اپنے پروردگار
کی حمد کر رہے ہوں گے، اس کے ایفائے وعدہ پر جیسا کہ ارشاد باری ہے:

"وہ کہہ رہے ہوں گے کہ ساری حمد اللہ کے لیے ہے"

جس نے ہم سے کیے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا۔"

(سورۂ زمر۔ آیت ۷۴)

جہاں تک بدکاروں کا تعلق ہے تو وہ حسرت و ندامت میں مبتلا ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے:

"ہائے ہماری خرابی! یہ ہمیں ہمارے مرقدوں سے کس نے اٹھایا؟"

(سورۂ یٰس۔ آیت ۵۲)

تعقلِ قیامت

ہم بہت ہی کم یوم قیامت کا تعقل کرتے ہیں اور اسے ایک معمولی سا واقعہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتِ امر یہ ہے کہ پروردگار عالم اس دنیاوی عالم کا ذکر کرتے ہوئے جو کہ ہمارے نزدیک نہایت ہی وسیع اور اہمیت والا ہے" اسے لہو و لعب قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

"حیات دنیا تو بس لہو و لعب ہے۔"

(سورۂ محمدؐ۔ آیت ۳۶)

اور عالمِ آخرت کا ذکر وہ نبأ عظیم سے کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے:

"یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے ہیں؟ نبأ عظیم کے بارے میں؟"

(سورۂ نبأ۔ آیت ۱-۲)

پس ہمارا فریضہ ہے کہ ہم قیامت کو امر عظیم کی حیثیت سے پہچانیں جبکہ اولین و آخرین جو ابتداء خلقت سے قیامت تک پیدا ہوئے ہونگے سب کے سب جمع ہوں گے تاکہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے۔ وہ ایسی ساعت ہوگی جب لوگ مدہوش و حیرت زدہ ہوکر ڈگمگا

رہے ہوں گے۔ ایک نہایت ہی وسیع فضا میں جہاں تمام لوگ خوف و ہراس اور اپنے کیے پر اضطراب و پریشانی کے عالم میں اکٹھے ہوں گے۔

عمرو بن معدی کرب کا واقعہ

عمرو ابن معدی کرب شہ سوارانِ عرب اور ان کے بہادروں میں سے تھا۔ وہ کئی ایک اسلامی غزوات و فتوحات میں بھی شریک ہوا۔ اس کے اسلام لانے کا واقعہ یوں بیان ہوا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس ہوئے تو عمرو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پیغمبر خداؐ نے اس سے فرمایا: "اے عمرو! مسلمان ہو جا تو اللہ تجھے فزعِ اکبر سے امان دے گا۔"

اس نے کہا: "اے محمدؐ! یہ فزعِ اکبر کیا ہے؟ کیونکہ میں تو کوئی خوف نہیں کرتا۔"

نبی اکرمؐ نے فرمایا: "وہ ایسا نہیں، جیسا کہ تم سمجھتے اور گمان کرتے ہو، لوگوں کو ایک نہایت شدید چیخ یا آواز سنائی دے گی، جس سے ہر مردہ جاگ اٹھے گا اور ہر زندہ مر جائے گا۔ سوائے ان کے جن کے لیے اللہ چاہے گا۔ پھر ایک دوسری چیخ یا آواز ہوگی تو جو مر گئے تھے وہ بھی زندہ ہو جائیں گے اور تمام کے تمام لوگ صف بستہ ہو کر کھڑے ہوں گے۔ آسمان پھٹ پڑے گا۔ زمین ہلنے لگے گی اور آگ کے شعلے پہاڑوں کی طرح بلند ہوں گے۔ اس وقت ہر ذی روح کا دل اچھل پڑے گا اور اسے اپنا دین یاد آنے لگے گا۔ اس موقع پر ہر ایک اپنے آپ میں مشغول ہوگا سوائے ان لوگوں کے جن کے بارے میں اللہ کچھ اور چاہے گا تو ایسے حالات میں تمہارا کیا حال ہوگا، اے عمرو!"

اس نے جواب دیا: "میں تو بہت بڑی بات سن رہا ہوں"۔ پس وہ اور اس کی قوم کے دوسرے لوگ مشرف بہ اسلام ہو کر لوٹے"۔[1]

قیامت کی خوفناک حالتیں

معلوم ہوا کہ قیامت کا دن وہ ہو گا جبکہ انسان کو دہشت و وحشت ہر جانب سے گھیرے ہوگی۔ دنیا میں کی ہوئی بداعمالیوں کی وجہ سے جس سختی میں لوگ مبتلا ہوں گے اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ احادیث میں اس سے متعلق جو کچھ وارد ہوا ہے اس کے بیان کے لیے مستقل کتابوں کی ضرورت ہے۔ اس مختصر رسالے میں سب کی گنجائش نہیں البتہ اجمال و اختصار کے طور پر ہم تفسیر آیات اور احادیثِ معصوم ؑ سے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

زمین کی وضع و قطع بدل دی جائے گی۔ وہ گرم ہو کر چٹیل میدان بن جائے گی جہاں نہ کوئی رکاوٹ ہوگی نہ کوئی سایہ ہوگا۔ لوگ ایک دوسرے کو دُور دُور تک دیکھ سکیں گے نہ کوئی پہاڑ ہوگا نہ کوئی ٹیلہ، بلکہ وہ روزِ اوّل جس طرح بچھائی گئی تھی اسی طرح ہو جائے گی۔[2]

سخت گرمی اور پیاس[3] کے باوجود وہاں کوئی سایہ نہ ہوگا اور کھڑے

---

[1] بحار الانوار جلد ۷ صفحہ ۱۱۰

[2] بحار الانوار جلد ۷ صفحہ ۱۱۰ میں امام زین العابدین ؑ سے اس کی تفسیر یوں وارد ہوئی ہے کہ زمین ایسی ہوگی جس پر گناہ نہ کیے گئے ہونگے، نہ کوئی پہاڑ ہوگا نہ سبزہ [3] تفسیر صافی میں عیاشی کے حوالے سے امام محمد باقر ؑ کا قول ہے کہ "عذاب الھون" سے مراد قیامت کے دن کی پیاس ہے۔

ہونے پھر جگہ سے زیادہ کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ لوگ اس طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے کھڑے ہوں گے جیسے ترکش میں[1] تیر ہوتے ہیں۔ لوگ پسینے میں شرابور ہو رہے ہوں گے۔ کوئی پنڈلیوں تک پسینے میں ہوگا، کوئی گھٹنوں تک کوئی جانگھوں تک اور کوئی اس سے بھی زیادہ۔[2]

علاوہ بریں دنیا کے برخلاف قیامت کے دن لوگوں کی شکلیں بھی ان کی برائیوں کے اثر سے متغیر اور بگڑی ہوئی ہوں گی۔ ارشاد باری ہے:

"جس دن صور پھونکا جائے گا، اس دن تم لوگ فوج درفوج آؤ گے۔" (سورۂ نباء۔ آیت ۱۸)

اس آیت کی تفسیر کے بارے میں "مجمع البیان" میں ہے کہ معاذ ابن جبل نے پیغمبرؐ سے پوچھا تو حضورؐ نے فرمایا: "اے معاذ! تم نے ایک عظیم امر کے بارے میں پوچھا ہے۔" اس کے بعد آنحضرتؐ کی آنکھیں نمناک ہو گئیں، پھر فرمایا: "خدا میری امت کے لوگوں میں سے دس قسم کے لوگوں کو مسلمانوں سے الگ کر کے مختلف صورتوں میں محشور کرے گا۔

---

[1] امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن لوگ رب العالمین کے حضور میں اس طرح کھڑے ہونگے جیسے ترکش میں تیر ہوتے ہیں (بحار الانوار جلد ۷ صفحہ ۱۱۱)۔ [2] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو اتنا پسینہ آئے گا کہ بعض کا پسینہ پنڈلی تک پہنچے گا۔ بعض کا گھٹنوں تک، بعض کا جانگھوں تک اور بعض کا دل تک۔ (کفایۃ الموحدین جلد ۳ صفحہ ۳۳۶)۔

کچھ لوگ بندر کی شکل میں ہوں گے، کچھ لوگ سوّر کی شکل میں ہوں گے۔ کچھ لوگ سر نیچے اور پاؤں اوپر، الٹے لٹکائے ہوئے ہوں گے اور اسی حال میں کھینچے جا رہے ہوں گے۔ کچھ اندھے ہو کر ٹٹول رہے ہونگے۔ کچھ گونگے بہرے مخبوط الحواس ہوں گے۔ کچھ ایسے ہونگے جو اپنی زبان چبا رہے ہوں گے اور ان کے منہ سے پیپ بہہ رہا ہو گا۔ جسے دیکھ کر دوسروں کو گھن آئے گی۔ کچھ ایسے ہوں گے جن کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے۔ کچھ ایسے ہوں گے جنہیں آتشیں صلیب پر لٹکایا ہوا ہوگا۔ کچھ ایسے ہوں گے جن کے بدن سے مردار کے بدن سے بھی زیادہ بدبو پھوٹ رہی ہوگی اور کچھ ایسے ہوں گے جو جلتے ہوئے تارکول کے جبے پہنے ہوئے ہوں گے اور وہ لباس ان کے جسم سے چپکا ہوا ہوگا۔

وہ لوگ جو بندر کی شکل میں ہوں گے وہ چغلی کھانے والے ہوں گے۔ وہ لوگ جو سوّر کی شکل میں ہوں گے وہ رشوتیں لینے والے ہونگے۔ وہ لوگ جو الٹے لٹکے ہوں گے وہ سود خوار ہوں گے۔ وہ جو اندھے ہوں گے وہ اپنے فیصلوں میں ظلم و جور برتنے والے ہوں گے۔ وہ جو گونگے بہرے ہوں گے وہ اپنے اعمال پر اترانے والے ہوں گے۔ وہ جو اپنی زبان چباتے ہوں گے وہ ایسے علماء اور قاضی ہوں گے جن کے اعمال ان کے اقوال کے برخلاف تھے۔ وہ لوگ جن کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے وہ اپنے پڑوسیوں کو اذیتیں پہنچانے والے ہوں گے۔ وہ لوگ جو آتشیں صلیبوں پر لٹکے ہوں گے، وہ حکام کے پاس لوگوں کی ناحق شکایتیں کرنیوالے ہوں گے۔ وہ لوگ جو مردار سے زیادہ بدبودار ہوں گے وہ شہوات ولذات میں مبتلا رہنے والے ہوں گے اور اپنے اموال میں سے اللہ کا حق نہ دینے

والے ہوں گے اور وہ جو آتشیں جبوں میں ہوں گے وہ فخر و غرور کرنیوالے ہوں گے۔

اس دن کی سختیوں میں سے ایک یہ بھی ہوگی کہ دنیا میں جو اعمالِ قبیحہ اور عقائد باطلہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے ہوں گے وہ بھی اس دن سب پر عیاں ہو جائیں گے۔ اللہ نے اس دن کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ "جس دن پوشیدہ چیزیں ظاہر ہو جائیں گی"

انبیاءؑ اور ملائکہ ایک جانب صف بستہ ہوں گے اور عام خلائق دوسری جانب ہوں گے۔ اہل جرائم میدان محشر میں اپنی اصلی حالت پر لائے جائیں گے اور تمام لوگ ان کے جرائم کو دیکھیں گے۔ یہ کتنی بڑی ذلت و فضیحت ہے! پھر سختیاں کرنے والے ملائکہ ان کا محاسبہ کریں گے۔

محدث فیض کاشانی نے "عین الیقین" میں لکھا ہے کہ شراب پینے والا اس حال میں محشور ہوگا کہ شراب کا مٹکا اس کی گردن سے لٹکا ہوگا اور پیالہ اس کے ہاتھ سے چپکا ہوگا۔ اس کے جسم سے مُردہ جانور کی بدبو سے بھی زیادہ بدبو آ رہی ہوگی۔ ہر ایک اسے دیکھے گا کہ یہ شرابی ہے اور دیکھ کر اس پر لعنت کرے گا۔ اسی طرح گانے بجانے والا اس حال میں لایا جائے گا کہ آلاتِ طرب اس کے ہاتھ میں ہونگے اور اس کے سر پہ مار پڑ رہی ہوگی۔ غرضیکہ ہر عمل کرنیوالا اپنے عمل سے پہچانا جائے گا۔

"مجرموں کو ان کی علامتوں سے پہچانا جائے گا اور انہیں بالوں اور پیروں سے کھینچا جائے گا۔"

(سورۂ رحمٰن - آیت ۴۱)

دل اچھل کر حلق تک آجائیں گے

اس دن خوف کے مارے دل اچھل کر حلق تک پہنچ رہے ہوں گے۔ نہ وہ نیچے جائیں گے نہ جسم سے باہر آئیں گے۔ اس طرح کوئی ذرا سی بھی راحت نصیب نہیں ہوگی۔ رنج وغم اور شدتِ خوف سے یہ محسوس ہوگا جیسے دل ان کے منہ میں آگئے ہوں۔ ارشادِ ربانی ہے:

"اور ڈرایئے ان کو بہت جلد آنے والے دن سے جبکہ دل گلے کی ہنسلیوں کے پاس ہونگے اور ان کا منہ بند ہوگا۔"

(سورۂ غافر۔ آیت ۱۸)

اس روز خدا کی ہیبت سے لوگوں کی آوازیں پست ہوں گی۔ اگر فریاد کریں گے تو کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ ارشادِ باری ہے:

"اور آوازیں رحمٰن کے خوف سے پست ہو چکی ہوں گی۔ لہٰذا سوائے خفیف آواز کے تم کچھ اور نہ سنو گے۔"

(سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱۰۸)

اس دن کا وصف یوں بیان ہوا ہے:

"جس دن نہ کوئی مال کام آئے گا نہ بیٹے۔"

(سورۂ شعراء۔ آیت ۸۸)

اور یہ کہ:

"اس دن انسان فرار چاہے گا اپنے بھائی سے، اپنی ماں سے، اپنی بیوی سے اور اپنے بچوں سے۔"

(سورہ عبس۔ آیت ۳۴)

ان آیات کریمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اپنے قریب ترین

عزیزوں سے بھی رشتہ ٹوٹ چکا ہوگا' ان بداعمالیوں کی وجہ سے جو اس سے دنیا میں سرزد ہوئی ہوں گی۔ لہٰذا ہر ایک کو بس اپنی فکر ہوگی' یہ جان کر کوئی کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ وہ اپنے عزیزوں سے بھاگنا چاہے گا' اس خوف سے کہ وہ اپنے حقوق طلب کریں گے۔ مگر فقراء و مساکین سمیت جن جن کے حقوق اس نے غصب کیے ہوں گے وہ اپنے حقوق کے بدلے اس کی نیکیاں لے رہے ہوں گے اور اس کی برائیوں میں اضافہ ہوتا جائیگا۔

افسوس اس وقت کیا حال ہوگا جب کوئی شخص اپنی نیکیاں ایسے دوسروں کے نامۂ اعمال میں دیکھے گا جن کی اس نے غیبت کی ہوگی یا ان پر کوئی ظلم کیا ہوگا اور کیا حال ہوگا جب مظلوم اس سے اپنا قصاص لینے کے لیے اسے گھیر لیں گے۔

سب سے بڑی مصیبت اس دن یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اپنی نگاہِ لطف اس سے پھیرے گا۔ اس کو سب کے سامنے رسوا کرے گا اور ملائکہ کو حکم دیگا کہ وہ اسے پکڑ کر جہنم میں لے جائیں۔ جیسا کہ اس کا قول ہے:

"پکڑو اسے اور ہتھکڑی لگاؤ۔ پھر اسے جہنم میں جھونک دو پھر ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں باندھو۔"

(سورۂ حاقہ۔ آیت ۳۰۔۳۲)

ابو حمزہ ثمالی کو تعلیم کردہ دعا میں اسی کیفیت کی جانب اشارہ ہے۔ پس ان احوال قیامت پر غور کرو اور سوچو کہ کیا سوالات تم سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ موت آنے سے پہلے ہی اپنا محاسبہ اپنے آپ کرلو اور جو تقصیر ہوئی ہو اس کا تدارک کرو۔ حقوق کے بارے میں دانہ دانہ ادا کرو اور جس کسی کو بھی تمہاری زبان یا تمہارے ہاتھ سے کوئی نقصان پہنچا ہو

اس سے معافی طلب کرو۔

ہمارے مولا امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے : اپنا محاسبہ خود کرو، قبل اس کے کہ تم سے حساب لیا جائے اور اپنے اعمال کو خود تول لو، اس سے پہلے کہ وہ میزان عمل میں تولے جائیں۔ ان لوگوں میں سے نہ بنو جو آج اس دنیا میں بہت خوش ہیں۔ لوگوں کی عزت و آبرو اپنی زبان سے لوٹتے ہیں اور دوسروں کا مال ناحق کھاتے ہیں تاکہ قیامت کے دن جب بساطِ عدل بچھے تو تمہارا غم و اندوہ بہت زیادہ نہ ہو اور اس دن تم فقیر عاجز کی مانند نہ رہو کہ نہ تمہارے پاس ادا ءِ حق کے لیے کچھ ہو نہ تمہارے پاس کوئی عذر ہو۔

"ہرگز ہرگز اللہ کو غافل نہ سمجھنا ان چیزوں سے جنہیں ظالم کر رہے ہیں۔ اللہ تو انہیں اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے، جب آنکھیں چڑھی ہوں گی ذلت سے، ان کے سر جھکے ہوں گے۔ وہ نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکیں گے اور ان کے دل ہول رہے ہوں گے۔"

(سورۂ ابراہیمؑ۔ آیت ۴۲۔۴۳)

تقویٰ لباسِ قیامت ہے

لوگ جب اپنی قبروں سے نکلیں گے تو وہ برہنہ پا، برہنہ جسم ہوں گے اور سب وحشت و دہشت کے عالم میں ایک ہی میدان میں جمع کیے جائیں گے۔

کتاب "معالم الزلفیٰ" میں عیاشی کی سند سے امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے :

"جب قیامت کا دن ہو گا تو پروردگارِ عالم تمام لوگوں کو

ایک ہی میدان میں جمع کرے گا۔ اس حال میں کہ وہ برہنہ
جسم برہنہ پا اور ابتدائی خلقت پر ہوں گے۔ پھر وہ
کھڑے ہونگے تو پسینہ سر سے پاؤں تک ہوگا۔“[1]

البتہ وہ لوگ جو دنیا میں صاحبِ تقویٰ رہے ہوں گے وہ میدان حشر میں لباس پہنے آئیں گے۔ اسی طرح وہ مومنین جو دنیا میں تو توبہ نہ کرسکے مگر عالمِ برزخ میں ان کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا، وہ بھی لباس میں ہوں گے۔ پس تباہی و خرابی اس کے لیے ہے جو نہ دنیا میں متقی تھا، نہ ایمان کی حالت پر مرا کہ برزخ میں اس کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا۔

تفسیر علی ابن ابراہیم قمی میں امام صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ امیرالمومنینؑ نے جناب رسالتمآبؐ سے اللہ کے اس قول کی تفسیر پوچھی:

”جس دن ہم صاحبان تقویٰ کو جمع کریں گے بارگاہ
رحمٰن میں وفد در وفد“ (سورۂ مریم۔ آیت ۸۵)

تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

”اے علیؑ! یہ وفد پیدل نہیں بلکہ سوار لائے جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اللہ سے تقویٰ اختیار کیا تو اللہ ان سے محبت کرنے لگا۔ انھیں اپنے سے مخصوص کرلیا اور ان کے اعمال سے راضی ہوگیا۔“ پھر آپ نے فرمایا: ”اے علیؑ! قسم ہے اس ذاتِ گرامی کی جس نے دانے کو نشوونما دی اور بے جان کو جاندار بنایا۔ وہ متقین اپنی قبروں سے یوں نکلیں گے کہ ان کے چہرے نورانی ہونگے، ان کے جسم پر دودھ جیسے سفید

---

[1] کفایۃ الموحدین جلد ۳ صفحہ ۳۳۱

کپڑے ہوں گے اور پاؤں میں سنہری جوتے ہوں گے۔" [1]

حضرت آدمؑ سے ترکِ اولیٰ ہوا تو ان کے جسم سے کپڑے اتر گئے۔ چنانچہ وہ دونوں (یعنی آدمؑ و حوا) جنت کے پتوں سے اپنے کو ڈھانپنے لگے [2] رسوائی سے بچنے کے لیے۔ جب یہ نبی کا حال ہو تو گنا ہگاروں کا کیا حال ہوگا۔ جب وہ میدانِ حشر میں داخل ہوں گے اور ان کے لیے کوئی ستر نہ ہوگا اور وہاں ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین کے علاوہ دوسرے تمام لوگ بھی ہوں گے۔

ہمارے مولا امام زین العابدین علیہ السلام اپنے مقام عصمت و امامت کے باوجود، ماہِ رمضان کی سحر کے اوقات میں رویا کرتے تھے اور بارگاہِ ایزدی میں تضرّع و عاجزی کے طور پر فرماتے تھے:

"میں روتا ہوں اس لیے کہ کہیں قبر سے عریاں و ذلیل نہ اٹھوں۔"

پس ہم سب پر واجب ہے کہ ہم اس امامِ عظیم کی پیروی کرتے ہوئے سحر کے وقت بکا و دعا کے ذریعے بارگاہِ ایزدی میں تقرب حاصل کریں اور کوئی کوتاہی نہ کریں تاکہ اس کی رحمت ہمیں اپنے دامن میں لے لے۔

۵۰ ہزار سال کا دن

احادیثِ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا دن ۵۰ ہزار سال کے برابر ہوگا۔

---

[1] کفایۃ الموحدین جلد ۳ [2] سورۂ اعراف - آیت ۲۲

ارشاد ربانی ہے:

"ملائکہ اور روح، اللہ کی طرف عروج کریں گے ایسے دن میں جس کی مقدار ۵۰ ہزار سال ہوگی۔"

(سورۂ معارج - آیت ۴)

اس دن پچاس موقف ہوں گے اور ہر موقف ہمارے دنیاوی حساب سے ہزار سال کا ہوگا۔ حالانکہ نہ یہ رفتارِ سیارگاں ہوگی نہ دن رات ہونگے بلکہ یہ اندازۂ وقت بُعد و مسافت کے اعتبار سے ہے۔

یہ یوم قیامت کو یوم کہنا، باوجود اس کے کہ نہ آفتاب طلوع ہوگا نہ غروب ہوگا۔ غالباً اس امر کی جانب اشارہ ہے کہ وہاں تمام مخفی چیزیں اسی طرح ظاہر ہوں گی جیسے دنیا میں دن کو ظاہر ہوتی ہیں جبکہ رات کی سیاہی چھٹ جاتی ہے۔

یہ تو یومِ قیامت کی مدت کا ذکر ہوا۔ جہاں تک مواقف کا تعلق ہے تو ان کی تعبیر دشوار گزار ٹیلوں سے کی گئی ہے۔ ارشاد باری ہے:

"پس نہیں چڑھا وہ دشوار گزار ٹیلے پر۔"

(سورۂ بلد - آیت ۱۱)

اور مولائے کائنات امیر المومنین علیہ الصلوٰۃ والسلام ارشاد فرماتے ہیں:

"اے لوگو! تمہارے سامنے ایک نہایت دشوار گزار پہاڑی راستہ ہے اور نہایت ہولناک منزلیں ہیں جہاں سے تمہارے لیے گزرنا اور جہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔ پس یا تو اللہ کی رحمت سے نجات پاؤ گے یا ایسی

ہلاکت میں پڑو گے جس کے بعد کوئی تلافی نہ ہوگی۔"
شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ "عقبات سے مراد وہ اعمالِ واجبہ ہیں جن کے بارے میں ٹھہرا کر پوچھا جائے گا۔ پس ہر عقبہ (یعنی دشوار گزار پہاڑی راستہ) کسی امر یا نہی کے نام سے موسوم ہوگا۔ اگر کوئی اس کی بجا آوری میں قصوروار پایا گیا تو وہیں اسے ٹھہرا کر مطالبہ و مواخذہ کیا جائے گا۔ پس اگر کوئی عمل صالح ہوا تو اللہ کی رحمت سے نجات پا کر آگے بڑھ جائے گا۔"

چنانچہ ان عقبات میں سے مثلاً ایک کا نام نماز ہے، دوسرے کا امانت ہے، تیسرے کا رحم اور چوتھے کا ولایت ہے جہاں تمام لوگوں کو ٹھہرا کر ولایت امیر المومنین وائمہ طاہرین علیہم السلام کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ جس کے پاس یہ دولت ہوئی اسے نجات ملے گی اور جس کے پاس نہ ہوئی وہ ہلاکت سے دوچار ہوگا۔ اس پر دلیل اللہ کا یہ قول ہے:

"اور ٹھہراؤ انہیں کہ ان سے سوال کیا جائے گا۔"

(سورۂ صافات۔ آیت ۲۴)

ان عقبات میں سے ایک نہایت اہم وہ عقبہ ہوگا جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یقیناً آپ کا پروردگار تاک میں ہے۔" (سورۂ فجر۔ آیت ۱۴)
پروردگار فرمائے گا: "میری عزت و جلالت کی قسم کوئی ظالم بچ کر نہیں جا سکتا۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "اے لوگو! اپنے نفس کا محاسبہ خود ہی کر لو۔ اس سے قبل کہ تمہیں محاسبہ و جوابدہی کے لیے ۵۰

ایسے مواقف پر ٹھہرایا جائے جن میں سے ہر ایک موقف پر ٹھہرنا تمہارے حساب کے مطابق ہزار سال ہوگا۔" پھر آپ نے آیت کی تلاوت فرمائی:

"اس دن میں جس کی مقدار ۵۰ ہزار سال کی ہوگی۔"

(بحارالانوار جلد ۷ صفحہ ۱۲۶)

اور علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: "بعید نہیں کہ اکثر کفار کا میدان قیامت میں ٹھہرنا ہزار سال کا ہو اور ان میں سے کچھ ۵۰ ہزار سال کے لیے ٹھہرائے جائیں۔ ان کے برخلاف کچھ مومنین محض ایک ساعت کے لیے ٹھہریں گے اور کچھ اس سے زیادہ کے لیے اپنے اعمال و حالات کے اعتبار سے۔" (بحارالانوار جلد ۷ صفحہ ۱۲۸)

لکھنے والے دو فرشتے

وہ امور جن کا ہم اعتقاد رکھتے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان نیکی و بدی میں سے جو کچھ بھی کرتا ہے اس کو دو فرشتے لکھتے رہتے ہیں جو اس کام کے لیے مقرر ہیں، البتہ ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ کیسے لکھتے ہیں۔ یہ ان امور میں سے ہے جنہیں ہم نبی کریمؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کے ارشادات کی روشنی میں جانتے اور مانتے ہیں ان کی کیفیتیں ہمیں نہیں معلوم۔

بہرطور یہ دونوں فرشتے ہر انسان کی نیکی و بدی کو لکھتے ہیں اور کسی بھی عمل کو ترک نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ نیتوں اور ارادوں کو بھی لکھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"جو بات بھی وہ زبان سے نکالتا ہے اس کے پاس تیار محافظ موجود ہوتے ہیں۔" (سورۂ قٓ۔ آیت ۱۸)

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو "کراماً کاتبین" کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

"معزز لکھنے والے جو جانتے ہیں ہر اس کام کو جو تم کرتے ہو۔" (سورہ انفطار۔ آیت ۱۲)

امام علیہ السلام سے ان فرشتوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ "وہ نیتوں کو کیسے جانتے ہیں؟" تو آپ نے فرمایا: "جب کوئی آدمی خیر کی نیت کرتا ہے تو اس کے منہ سے خوشبو آتی ہے اور جب کوئی شر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے منہ سے بدبو آتی ہے۔ پس فرشتے جان لیتے ہیں۔"

بعض روایات سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جب کوئی بندہ اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہے تب اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے لکھنے والے فرشتوں کو وہ گناہ بھلا دیتا ہے جو وہ لکھ چکے تھے اور اس کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ اس سلسلے میں چند روایات درج ذیل ہیں:

۱۔۔۔ ابو بصیر سے روایت ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ پر یہ وحی نازل کی: اے داؤدؑ! جب میرا ایک مومن بندہ کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، پھر اس سے توبہ کر لیتا ہے اور جب اس کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہ مجھ سے شرماتا ہے۔ تب میں اس گناہ کو معاف کر دیتا ہوں۔ لکھنے والے فرشتے کو بھلا دیتا ہوں اور اس گناہ کو نیکی میں بدل دیتا ہوں۔ ایسا کرنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ میں سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہوں۔" (بحار الانوار جلد ۶ باب توبہ)

۲۔۔۔ معاویہ بن وہب سے روایت ہے کہ: میں نے امام جعفر صادقؑ

کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جب کوئی بندہ مومن خالص نیت سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے اور دنیا و آخرت میں اس کے گناہوں کو ڈھانپ دیتا ہے۔ تب امامؑ سے اس کی کیفیت کے متعلق پوچھا گیا تو ارشاد ہوا: گناہ لکھنے والے فرشتے اس کے جو گناہ لکھ چکے تھے وہ ان کو بھلا دیئے جاتے ہیں۔ اس بندہ کے اعضاء بدن کو اس کے گناہ چھپانے کا حکم دیا جاتا ہے اور زمین پر اس نے جو عمل بد کیا، اس کو بھی اس کے چھپانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پھر وہ بندہ اللہ پاک سے اس وقت ملاقات کرتا ہے جب اس کے گناہ کی گواہی دینے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ (بحار الانوار جلد ۶ باب توبہ)

۳ ــــ مسعودی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: امیر المومنین امام علیؑ نے فرمایا: "جو بندہ توبہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ وہ اس کے اعضاء بدن کو اس کے گناہ چھپا لینے کا حکم دیتا ہے، زمین کو بھی اس کے گناہ چھپا لینے کا حکم دیتا ہے اور لکھنے والے فرشتے اس کے جو گناہ لکھ چکے تھے، وہ بھی ان کو بھلا دیتا ہے۔

(بحار الانوار جلد ۶۔ باب توبہ)

مذکورہ بالا احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو فرشتے ہر انسان کے اعمال کو لکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کبھی انسان پر مہربان ہو کر فرشتوں کو اس کے وہ گناہ بھلا دیتا ہے جو انھوں نے لکھے تھے بشرطیکہ انسان توبہ استغفار کرے یا اس قسم کا عمل بجا لائے جو گناہ کو مٹا دینے کا موجب ہو۔

یہ اللہ تعالیٰ کے الطاف میں سے ہے کہ جب کوئی بندہ کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اس ارادے پر ایک نیکی اس کے لیے لکھ لیتا ہے پھر جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو اس کے بدلے میں اس کے لیے دس نیکیاں

لکھی جاتی ہیں۔ لیکن جب وہ کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اس وقت تک نہیں لکھا جاتا جب تک وہ اس پر عمل نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جو نیکی لے کر آئے تو اس کے لیے اس کے مثل دس نیکیاں ہیں اور جو بُرائی لائے تو اس کو بس ایک ہی برائی کا بدلہ ملے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔"

(سورۂ انعام- آیت ۱۶۰)

پھر یہ بھی اللہ تعالیٰ کا مزید لطف و کرم ہے کہ جب کوئی بندۂ خدا برائی کرتا ہے تو وہ فرشتہ جس کا نام رقیب ہے۔ اس فرشتے سے جس کا نام عتید ہے کہتا ہے: "اسے مہلت دو، شاید کہ یہ نادم ہو کر توبہ کرلے۔" پس اسے سات ساعتوں یا اس سے زیادہ دیر کی مہلت دی جاتی ہے۔ اگر وہ اس کے بعد بھی توبہ نہیں کرتا تو فرشتے آپس میں کہتے ہیں: "یہ بندۂ خدا اپنے رب سے حیا نہیں کرتا۔" تب وہ بُرائی اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہے اور دوسری حدیث میں ہے: "طوبیٰ ہے اس کے لیے جو اپنے نامۂ اعمال میں ہر گناہ کے نیچے لکھا ہوا پائے: اس نے اللہ سے توبہ کرلی۔" [1]

شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب عقائد میں لکھا ہے:

"مولائے کائنات امیرالمومنین علیہ السلام ایک روز نوجوانوں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے۔ وہ آپس میں لغو باتیں کر رہے

---

[1] اصول کافی جلد ۴ صفحہ ۱۷۳ علاوہ بریں باب توبہ میں مزید حدیثیں اسی قسم کی آئیں گی۔

تھے اور ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ جناب امیرؑ نے ان سے فرمایا: "کیا یہ بہتر ہے کہ تمہارے نامۂ اعمال میں ایسی باتیں لکھی جائیں؟"

انہوں نے کہا: "کیا اس طرح کی باتیں بھی نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہیں؟"

امامؑ نے فرمایا: "ہاں! یہاں تک کہ ہر سانس لکھی جاتی ہے۔"

یہ بھی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ہر دوشنبہ و پنجشنبہ کو لوگوں کے اعمال نبی کریمؐ اور ائمۂ اطہار علیہم السلام کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے کہ تم لوگ عمل کرو کہ عنقریب تمہارے عمل کو اللہ، رسولؐ اور مومنین دیکھیں گے۔"

(سورۂ توبہ۔ آیت ۱۰۵)

اس بنا پر جب کسی بندۂ خدا سے کوئی ذرا سی بھی نیکی ہوتی ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے راستے سے کسی ٹھوکر لگنے والے پتھر کو ہٹا دینا، تو وہ بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھ لی جاتی ہے تو بڑے بڑے اعمالِ حسنہ کیسے نہ لکھے جائیں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"یقیناً نیکوکاروں کا نامۂ اعمال علّیین میں ہے۔"

(سورہ المطففین۔ آیت ۱۸)

اور یقیناً بدکاروں کا نامۂ اعمال سجّین میں ہے۔"

(سورہ المطففین۔ آیت ۱۸)

پس جس کو اس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیدیا گیا، وہ کہے گا: "آؤ (لوگو!) پڑھو میرے نامۂ اعمال کو۔ میں نے گمان کیا

تھا کہ اپنا حساب دیکھوں گا۔" پس وہ شخص پسندیدہ زندگی میں ہوگا جنت عالیہ میں، جس کے پھل بہت جھکے ہوئے قریب ہوں گے۔ ان لوگوں سے کہا جائے گا:

"کھاؤ پیو مبارک ہوں تمہیں ان اعمال کے بدلے
جنہیں تم نے اپنی فرصت کے دنوں میں کر لیا تھا۔"

(سورۂ حاقہ۔ آیت ۱۹ تا ۲۴)

خاتمہ

وہ لوگ جو فزع اکبر سے محفوظ رہیں گے

آگاہ ہو کہ کچھ لوگ قیامت کے ہولناک ترین خوف سے محفوظ رہیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو ان اچھی خصلتوں سے متصف ہوں گے جن کا حکم شریعت مطہرہ نے دیا ہے۔ مثلاً امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "جو کسی غمزدہ مومن کی اس کی مصیبت کے وقت فریاد رسی کرے، اس کا غم و کرب دور کرے اور اس کی حاجت پوری کردے تو اس کے بدلے میں اس کے لیے ستر رحمتیں ایسی ہوں گی جو اسے قیامت کے خوفناک احوال سے بچائیں گی۔"

علاوہ بریں احادیث معصوم سے جن اور خصلتوں کا پتا چلتا ہے وہ یہ ہیں: صاحب ایمان بزرگ کی توقیر کرنا، حرم میں مدفون ہونا، حرمین (مکہ و مدینہ) میں سے کہیں وفات پانا، مومن کی قبر پہ ہاتھ رکھ کر

سات مرتبہ سورہ القدر پڑھنا، فحاشی وشہوت رانی کا موقع ملنے کے باوجود خوف خدا کرتے ہوئے ان سے اجتناب کرنا، دوسروں کے بجائے اپنے آپ کو ناپسند کرنا اور مکہ مکرمہ کی راہ میں جاتے یا آتے ہوئے وفات پانا۔[1]

حضرت موسیٰ ابن عمران علیہ السلام نے اپنی مناجات میں کہا:
"میرے معبود! اس شخص کے لیے کیا جزا ہے، جس کی آنکھیں تیرے خوف میں اشک آلود ہوں؟" تو ارشاد ہوا: "موسیٰؑ! میں اس کے چہرے کو آتش جہنم کی گرمی سے بچالوں گا اور سب سے بڑے خوف کے دن اسے امن دوں گا۔"[2]

حب اہل بیتؑ فزع اکبر سے بچاتی ہے

وہ چیزیں جو فزع اکبر سے نجات دلانے والی ہیں ان میں اہم ترین چیز اہل بیتِ رسولؐ کی محبت ہے۔ انہی حضرات کی محبت وہ نیکی ہے جس کے بارے میں ارشاد باری ہے:

"جو نیکی پیش کرے اس کے لیے اس سے بڑھ کر جزا ہے اور وہ لوگ اس دن کے خوف سے امان میں ہوں گے اور جو برائی کرے گا تو ان لوگوں کے منہ آگ میں اوندھا دیے جائیں گے۔" (سورۂ نمل۔ آیت ۸۹)

عبید اللہ ابن عبد اللہ حاکم حسکانی نے "شواہد تنزیل" میں ابو عبد اللہ الجدلی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں امام علی بن ابی طالبؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: "اے ابو عبد اللہ!

---

[1] و [2] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۳۶۰

کیا میں تمہیں اس نیکی کی خبر نہ دوں کہ جو اسے پیش کرے گا، اللہ اس کو اس کی جزا کے طور پر جنت میں داخل کر دے گا اور اس بدی کے بارے میں نہ بتاؤں کہ جو اسے پیش کرے گا، اللہ اس کو اس کے بدلے میں اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا اور اس کا کوئی عمل قبول نہ کریگا؟"

میں نے عرض کیا: "یا امیر المومنینؑ ضرور بتایئے۔"

جناب امیرؑ نے فرمایا: "وہ نیکی ہماری محبت ہے اور وہ بدی ہم سے بغض و عداوت ہے۔" [1]

اور حافظ ابو نعیم نے معتبر سند کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے اپنے آباءِ طاہرینؑ کی سند سے اس آیت "یقیناً اس دن تم لوگوں سے نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔" کی تفسیر میں فرمایا: "نعمت سے مراد امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالبؑ کی ولایت ہے۔" [2]

علامہ قندوزی ہی نے حاکم ابن احمد بیہقی کی سند سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ راوی نے کہا: ہم لوگ ایک دن امام علیؑ بن موسیٰ رضاؑ کی خدمت میں تھے تو ان سے بعض فقہا نے کہا: "آیت (مذکورہ بالا) میں لفظ "نعیم" (یعنی نعمت) سے مراد ٹھنڈا پانی ہے۔" تو آپ نے بلند آواز میں فرمایا: "تم لوگوں نے اس کی اس طرح تفسیر کی ہے۔ کسی نے ٹھنڈا پانی کہا، کسی نے اسے نیند قرار دیا اور کسی نے اس کو اچھا کھانا سمجھا۔ مگر مجھ سے میرے پدر بزرگوار نے حضرت جعفرؑ ابن محمدؑ

---

[1] و [2] سلیمان قندوزی حنفی: ینابیع المودۃ صفحہ ۱۱۱

سے روایت کی ہے کہ جب ان کی خدمت میں اس قسم کے اقوال ذکر کیے گئے تو آپ غضبناک ہوئے اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ان چیزوں کے بارے میں نہیں پوچھے گا جن کو اس نے بطور تفضّل انہیں عطا کر دیا ہے۔ نہ وہ ان چیزوں کا ان پر احسان جتائے گا۔ ایسا کرنا تو مخلوقین کے لیے بھی نازیبا ہے تو خالق عالم جلّت عظمتہ، ایسی بات کو اپنے لیے کیسے پسند کر سکتا ہے؟ نعیم سے مراد تو درحقیقت ہم اہل البیتؑ سے محبت و موالات رکھنا ہے جس کے بارے میں اللہ توحید و نبوت کے بعد سوال کرے گا کیونکہ اگر کوئی بندۂ خدا ان تمام چیزوں (یعنی توحید، نبوت اور محبت و موالات اہل البیتؑ) کو پورا کرے گا تو یہ چیزیں اسے نعیم جنت کا حقدار بنا دیں گی جو کبھی زائل نہیں ہوگی۔ مجھ سے میرے پدر بزرگوار حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام نے بیان کیا کہ مجھ سے میرے پدر بزرگوار حضرت جعفر صادقؑ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت محمد باقرؑ سے، انہوں نے حضرت علی زین العابدینؑ سے، انہوں نے حضرت امام حسینؑ سے، انہوں نے حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اے علیؑ! ہر بندۂ خدا سے اس کی موت کے بعد سب سے پہلے ان گواہیوں کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور تم مومنین کے ولی ہو۔ پس جس نے ان گواہیوں کا اقرار کیا اور اس کے عقیدے میں یہ باتیں ہوئیں تو وہ اس نعمتِ خداوندی کی طرف جائے گا جس کو کبھی زوال نہیں۔" علامہ قندوزی نے ایسی ہی حدیثیں امام محمد باقرؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ سے بھی نقل کی ہیں۔ (ینابیع المودۃ صفحہ ۱۱۱-۱۱۲)۔

علاوہ بریں علامہ قندوزی نے دیلمی کی کتاب "الفردوس" سے حضرت ابو سعید خدری کی یہ روایت بھی لکھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت " اور ٹھہراؤ ان کو کہ ان سے پوچھا جائے گا " کی تفسیر میں فرمایا: "لوگوں سے ولایتِ علی ابن ابی طالبؑ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (ینابیع المودۃ صفحہ ۱۱۲)

نیز یہ آیتیں اس امر پہ دلالت کرتی ہیں کہ محبتِ اہل البیتؑ روزِ فزع اکبر سے امان دلانے والی چیز ہے۔ ارشاد باری ہے:

"یقیناً وہ لوگ جن کو ہماری طرف سے پہلے ہی نیکی مل چکی ہوگی وہ اس عذاب سے دُور رہیں گے۔"

(سورۂ انبیاءؑ۔ آیت ۱۰۰)

اور یہ کہ:

ان لوگوں کو فزع اکبر سے کوئی حزن وغم نہ ہوگا۔"

(سورۂ انبیاءؑ۔ آیت ۱۰۳)

حاکم حسکانی نے کہا مجھ سے بیان کیا ابو الحسن فارسی نے، ان سے ابو جعفر محمد ابن علی فقیہ نے، ان سے ان کے والد نے، ان سے سعد ابن عبداللہ نے، ان سے احمد ابن محمد ابن خالد نے قاسم ابن یحییٰ سے انہوں نے اپنے جد حسن ابن راشد سے، انہوں نے حضرت جعفرؑ ابن محمدؑ سے اپنے آباء و طاہرینؑ کے حوالے سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اے علیؑ! یہ آیت تمہارے اور تمہارے دوستوں کے حق میں نازل ہوئی ہے: یقیناً وہ لوگ جن کو ہماری طرف سے پہلے ہی نیکی مل چکی ہوگی وہ اس عذاب سے دُور رہیں گے۔"

اور اسی سند مذکور سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اے علیؑ! یہ آیت تمہارے اور تمہارے دوستوں کے حق میں نازل ہوئی ہے: "ان لوگوں کو فزع اکبر سے کوئی غم نہ ہوگا۔" دوسرے لوگ موقفِ قیامت میں کھڑے حساب دے رہے ہوں گے اور تم لوگ جنت میں لطف اندوز ہو رہے ہو گے۔ (شواہد التنزیل جلد ا صفحہ ۳۸۴/۳۸۵)

اس آیت کی تفسیر میں کہ:

"جو نیکی کا اکتساب کرے ہم اس کی نیکی میں اضافہ کرتے ہیں۔" (سورۂ شوریٰ۔ آیت ۲۳)

حافظ قندوزی حنفی نے ینابیع المودۃ میں ثعلبی کے حوالے سے حضرت عبداللہؓ ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "نیکی کمانے سے مراد آلِ رسولؐ سے مودّت رکھنا ہے۔" یہی تفسیر ایک دوسری روایت سے بھی مروی ہے۔ (ینابیع المودۃ صفحہ ۱۱۸ مکتبۂ بصیرتی)

اسی کتاب میں ہے کہ ثعلبی نے جابر جعفی کی سند سے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس ارشاد باری تعالیٰ کے بارے میں پوچھا گیا: "وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اعمال کیے ان کے لیے طوبیٰ اور بہترین انجام ہے۔" (سورۂ رعد۔ آیت ۲۹) تو آنحضرتؐ نے فرمایا: طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جس کی اصل میرے گھر میں ہوگی اور اس کی شاخیں اہلِ جنت پر سایہ فگن ہوں گی۔"

لوگوں نے کہا: "یارسول اللہؐ! ہم نے پہلے پوچھا تھا تو آپ نے فرمایا تھا: اس کی اصل علیؑ کے گھر میں ہو گی۔" تو آپ نے فرمایا: "میرا گھر

اور علیؑ کا گھر ایک ہی ہوگا۔" (ینابیع المودۃ صفحہ ۱۹۶)

حافظ ابن مغازلی شافعی نے اپنی کتاب "مناقب علی ابن ابیطالبؑ" (صفحہ ۳۱۶ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ طہران) میں لکھا ہے:

"ہمیں خبر دی احمد ابن محمد ابن عبد الوہاب نے بطور اجازہ کہ ابو احمد عمر ابن عبد اللہ ابن شوذب نے ان لوگوں کو خبر دی اور کہا ہم سے بیان کیا عثمان ابن احمد دقاق نے، انہوں نے کہا ہم سے بیان کیا محمد ابن احمد ابن ابی العوام نے، انہوں نے کہا ہم سے بیان کیا ابن الصباح دولابی نے، انہوں نے کہا ہم سے بیان کیا حکم ابن ظہیر نے سُدّی کے حوالے سے کہ اس آیت "جو نیکی کا اکتساب کرے الخ" میں نیکی سے مراد آلِ رسولؐ سے مودّت ہے۔"

ابن حجر مکی ہیثمی نے اپنی کتاب "الصواعق المحرقہ" (صفحہ ۱۱۶ مطبوعہ مکتبۃ القاہرہ) میں اس آیت: "وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کیے وہی خیر البریّۃ ہیں۔" کی تفسیر میں لکھا ہے: حافظ جمال الدین زرندی نے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا: "اس سے مراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں۔ تم اور تمہارے شیعہ قیامت کے دن راضی و پسندیدہ ہو کر آؤ گے۔ جبکہ تمہارے دشمن مغضوب و مقید آئیں گے۔"

حضرت علیؑ نے پوچھا: "میرے دشمن کون ہوں گے؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "جو تم سے تبرّا کریں گے اور تم پر لعنت کریں گے۔"

نیز اسی کتاب کے صفحہ ۱۴۹ پر وہ اس آیت: "اور ٹھہراؤ

ان کو ان سے پوچھا جائے گا۔" کے بارے میں لکھتے ہیں: "ولایت علیؑ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

اسی روایت کو حسکانی نے اسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابوسعید خدری اور دوسرے حضرات کی سند سے لکھا ہے۔

(شواہد التنزیل جلد ۲ صفحہ ۱۰۶)

نیز حسکانی نے اصبغ ابن نباتہ کے حوالے سے حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول اس آیت "یقیناً جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ سیدھے راستے سے منحرف ہیں" کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ میری ولایت سے منحرف ہیں"۔

(شواہد التنزیل جلد ۱ صفحہ ۴۰۲)

حُبِ اہلبیتؑ قیامت میں خوف سے امان دلانیوالی ہے

جہاں تک ایسی احادیث کا تعلق ہے جو اس امر پہ دلالت کرتی ہیں کہ اہل البیت علیہم السلام کی محبت قیامت کے دن خوفناکی سے امان دلانیوالی ہے تو وہ شیعہ و سنی مسند ہائے سند میں بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے اہم ترین احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ابن عمر سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک دفعہ ہم نے حضرت رسولؐ سے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے متعلق پوچھا تو آپ نے ناراض ہو کر فرمایا: کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو کہ یہ اس آدمی کے متعلق پوچھ رہے ہیں جس کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرے جیسا اور عہدہ بھی میرے جیسا ہے بدون نبوّت کے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ جس نے علیؑ سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی، جس نے مجھ سے محبت کی اللہ اس سے خوش اور جس سے اللہ خوش ہو گا اس کا بدلہ جنت ہے۔ یہ بھی جان لو کہ جس نے علیؑ سے دوستی کی، فرشتے اس کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں اور اس کے لیے

جنت کے سارے دروازے کھول دیے جاتے ہیں کہ وہ جس دروازہ سے چاہے بدون حساب داخل جنت ہو جائے۔ حضور اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا: جو علیؑ سے محبت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیگا اور اس سے انبیاءؑ کی طرح حساب لیا جائے گا۔ جو علیؑ سے محبت کرے اس کو دنیا ہی میں آبِ کوثر اور طوبیٰ درخت کا پھل نصیب ہو گا۔ نیز وہ جنت میں ملنے والا اپنا اعلیٰ مکان بھی دیکھے گا۔

جو علیؑ سے محبت کرے، اس کو حالت نزع میں آسانی ہو گی اور اس کی قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں تبدیل کر دی جائے گی۔ جو علیؑ سے محبت کرے، اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے بدن کی ہر رگ کے عوض اسے ایک حور عطا کرے گا۔ وہ اپنے خاندان کے ۸۰ افراد کی سفارش کرے گا اور خدا اس کے جسم کے ہر بال کے عوض جنت میں اسے ایک باغ دے گا۔ جس نے علیؑ کا مرتبہ پہچانا اور ان سے محبت کی، اللہ تعالیٰ اس کے پاس ملک الموت کو اس طرح بھیجے گا جس طرح اس کو انبیاءؑ کے پاس ناز و نعمت دیکر بھیجتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو منکر و نکیر کی خوفناک شکلوں پر نظر کرنے سے بچائے گا۔ اس کی قبر کو منور کرے گا۔ اس کی قبر کو ستر سال کی مسافت تک کشادہ کر دے گا اور قیامت کے دن اس کا چہرہ چمکتا ہو گا۔ جو علیؑ سے محبت کرے، اللہ تعالیٰ اس کو صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ اپنے عرش کے سایہ میں محشور کرے گا اور اس کو قیامت میں خوف و خطر سے نجات ملے گی۔

جو علیؑ سے محبت کرے اللہ تعالیٰ اس کی نیکیاں قبول کرے گا۔ جو علیؑ سے محبت کرے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت کا نور بھر دے گا۔ اس

کی زبان پر اچھی باتیں جاری کرے گا اور اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دے گا۔ جو علیؑ سے محبت کرے زمین میں اس کو اللہ کے مملوک کا لقب نصیب ہوگا اور خدا سارے فرشتوں کے سامنے اپنے اس بندے پر فخر کرے گا۔ جو علیؑ سے محبت کرے اس کو عرش کے نیچے سے ایک فرشتہ آواز دیتا ہے: اے بندۂ خدا! اپنے عمل کو تازہ رکھو، بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے سارے گناہ معاف فرما دیے۔

جو علیؑ سے محبت کرے وہ قیامت میں ایسا روشن چہرہ لیکر حاضر ہوگا جیسے چودہویں رات کا چاند ہو۔ جو علیؑ سے محبت کرے اس کے سر پہ اللہ تعالیٰ بزرگی کا تاج رکھے گا۔ اس کو عزت کی چادر پہنائی جائے گی۔ جس نے علیؑ سے محبت کی وہ پل صراط سے بجلی کی طرح ایک دم پار ہو جائے گا اور اس کو کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ جس نے علیؑ سے محبت کی، اللہ تعالیٰ اس کو نفاق سے برائت اور جہنم سے خلاصی عطا کرے گا، پل صراط کا پروانہ دے گا اور عذاب سے بچائے گا۔

جس نے علیؑ سے محبت کی، نہ اس کے لیے کوئی حساب ہوگا اور نہ اس کے لیے کوئی میزان قائم کی جائے گی۔ اس کو کہا جائے گا کہ تم بدون حساب بہشت میں داخل ہو جاؤ۔ جس نے علیؑ سے محبت کی وہ حساب، میزان اور پل صراط کی سختیوں سے محفوظ رہے گا۔

جس نے آلِ محمدؑ کی محبت اپنے دل میں لیکر وفات پائی، فرشتے اسے خوش آمدید کہتے اور اس سے مصافحہ کرتے ہیں۔ ارواح انبیاءؑ اس سے ملنے کو آتے ہیں اور اس کی ہر حاجت پوری کی جاتی ہے۔

جس نے آلِ محمدؑ کی دشمنی اپنے دل میں رکھے ہوئے موت پائی وہ

کافر ہو کے مرا اور جس نے آلِ محمدؐ کی دوستی دل میں رکھے ہوئے موت پائی وہ مومن مرا اور میں جنت میں اس کا سرپرست ہوں گا۔"

(بحار الانوار جلد ۲۷ باب حبہم و نصرہم و ولایتہم)

۲ــــ امام صادقؑ اپنے آباء طاہرینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: اے علیؑ! جس وقت میری امت مٹی کے ذرات کی صورت میں میرے سامنے آئی تو میں نے ان کے چھوٹے بڑوں کی روحیں اجسام میں داخل ہونے سے پہلے ہی دیکھ لیں۔ پھر جب تمہارے اور تمہارے شیعوں کے سامنے سے میرا گزر ہوا تو میں نے تم سب کے لیے طلب مغفرت کی تھی۔ امام علیؑ نے عرض کی: یارسول اللہؐ! اس بارے میں کچھ اور بھی بتائیے۔

تب حضورؐ نے فرمایا: اے علیؑ! تم اور تمہارے شیعہ جب قبروں سے نکلیں گے تو سب کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح منور ہوں گے۔ تم لوگوں کے دکھ درد دُور ہو جائیں گے اور تم سب کو عرش کے سایہ میں آرام کی جگہ دی جائے گی۔ اس وقت دوسرے لوگ خوف کی حالت میں ہوں گے۔ مگر تم لوگ بے خطر ہو گے، دوسرے لوگ غم کے عالم میں ہوں گے لیکن تم لوگ بے غم ہو گے اور تمہارے لیے دسترخوان بچھائے جائیں گے، جبکہ دوسرے لوگ اعمال کے حساب میں پھنسے ہوں گے۔

(بحار الانوار جلد ۶۸ باب فضائل الشیعہ)

۳ــــ امالی شیخ صدوقؒ میں ابو عبداللہ جدلی سے روایت ہے کہ امام علیؑ نے مجھ سے فرمایا: اے عبداللہ! کیا میں تم کو وہ نیکی بتاؤں کہ جس نے یہ نیکی کی، وہ قیامت کے دن خوف و خطر سے محفوظ ہو گیا۔ پھر اسی طرح تم کو وہ برائی نہ بتاؤں کہ جس نے یہ برائی کی اللہ تعالیٰ اس کو

اوندھے منہ جہنم میں ڈالے گا۔ میں نے کہا: ضرور بتائیے، اے امیرالمومنینؑ!
امام علیؑ نے فرمایا: وہ نیکی ہماری محبت اور وہ برائی ہماری دشمنی ہے۔
(بحارالانوار جلد ۲۷ باب ثواب حبھم ونصرھم وولایتھم)
۴۔۔۔ امام علیؑ ابن الحسینؑ سے روایت ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا: ایک دن میں حضرت رسولؐ کے پاس بیٹھا تھا، اتنے میں امام علیؑ بھی تشریف لے آئے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا: اے علیؑ! کیا میں تم کو ایک خوشخبری نہ سناؤں؟ امام علیؑ نے کہا: ضرور سنائیے یا رسول اللہؐ!
حضور اکرمؐ نے فرمایا: یہ میرا دوست جبرائیلؑ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ خبر دے رہا ہے کہ اس نے تجھ سے اور تیرے شیعہ سے محبت کرنے والے کو سات خوبیاں عطا فرمائی ہیں: حالت نزع کی آسانی۔ وحشت قبر میں سہارا، قبر کی تاریکی میں روشنی، قیامت کے خطرات میں امن، میزان عمل میں پورا اترنا، پل صراط پر سے گزرنا اور ساری امت سے ۸۰ سال پہلے جنت میں داخل ہونا۔
(بحارالانوار جلد ۶۸ باب فضائل الشیعہ)
۵۔۔۔ زید ابن ثابت سے روایت ہے کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا: جس نے علی ابن ابی طالبؑ سے ان کی حیات میں اور موت کے بعد محبت کی، اللہ تعالیٰ اس کو ایمان اور امن کے ساتھ رکھے گا۔ جب تک کہ سورج طلوع و غروب ہوتا رہے اور جس نے علی ابن ابیطالبؑ سے ان کی حیات میں اور موت کے بعد دشمنی کی، جاہلیت کی موت مرے گا اور اس کے اس عمل کا حساب لیا جائے گا۔
(بحارالانوار۔ جلد ۳۹ باب ۸۷)

۶۔ تاریخ بغداد میں بی بی عائشہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضور اکرمؐ نے علی علیہ السلام سے فرمایا: تمہارے لیے یہ کافی ہے کہ تم سے محبت کرنے والے کو موت کے وقت مایوسی نہ ہو گی، قبر میں وحشت نہ ہو گی اور قیامت کے روز پریشانی نہ ہو گی۔ (بحارالانوار جلد ۳۹ باب ۸۷)

۷۔ عمر ابن شیبہ سے روایت ہے کہ امام باقرؑ نے فرمایا: جب قیامت برپا ہو گی تو حضور اکرمؐ، امام علیؑ اور ان کے شیعہ خوشبودار مشک کے دو فصیلوں پر نور کے منبروں پر ہوں گے۔ اس وقت دوسرے لوگ غمگینی میں ہوں گے لیکن وہ غمگین نہیں ہوں گے، دوسرے لوگ خوفزدہ ہوں گے لیکن وہ خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ پھر آپ نے اس قرآنی آیت کی تلاوت فرمائی:

"جو شخص نیک کام کرے گا اس کے لیے اس کی جزا اس سے کہیں بہتر ہے اور ایسے لوگ اس دن خوف و خطر سے محفوظ رہیں گے۔" (سورہ نمل۔ آیت ۸۹)

خدا کی قسم! نیکی سے مراد علی ابن ابیطالبؑ کی ولایت ہے۔ پھر امام باقرؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

"ان کو قیامت کا بڑے سے بڑا خوف بھی دہشت میں نہ لائے گا۔ فرشتے ان سے خوشی خوشی ملاقات کریں گے اور یہ خوشخبری دیں گے کہ یہی وہ تمہارا خوشی کا دن ہے جس کا دنیا میں تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔"[1]

(بحارالانوار جلد ۶۸ باب فضائل الشیعہ)

---

[1] سورۂ انبیاءؑ۔ آیت ۱۰۳

۸۔ عیون الاخبار الرضاؑ میں مذکور ہے کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا: جس نے میرے اہلبیتؑ سے محبت کی، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو امن و امان کے ساتھ محشور کرے گا۔

(بحار الانوار جلد ۲۷ باب ثواب حبہم ونصرہم وولایتہم)

۹۔ امام باقرؑ سے روایت ہے کہ آیت مبارکہ:

"ان کو قیامت کا بڑے سے بڑا خوف بھی دہشت میں نہ لائے گا۔" (سورہ انبیاؑ۔ آیت ۱۰۳)

کے متعلق حضور اکرمؐ نے فرمایا: ایسے شخص کو قیامت کے دن ایک اونٹ دے کر کہا جائے گا: تو جیسے چاہے قیامت کے میدان میں چل پھرے۔ پس وہ چاہے تو حساب کے مقام پر کھڑا ہو جائے اور چاہے تو جہنم کے کنارے کھڑا ہو جائے اور چاہے تو جنت میں داخل ہو جائے۔ تب جہنم کا محافظ فرشتہ اس کو پوچھے گا: "اے شخص تو کون ہے؟ تو کوئی نبی ہے یا وصی؟" اس وقت وہ شخص جواب دے گا: میں محمدؐ و آلِ محمدؐ کا شیعہ ہوں۔ اس پہ فرشتہ کہے گا: ہاں یہ اختیار تیرے ہی لیے ہو سکتا ہے۔ (بحار الانوار جلد ۳۹ باب ۸۷)

۱۰۔ حضرت رسولؐ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اے علیؑ! تیرے شیعہ برگزیدہ ہیں۔ اگر تو اور تیرے شیعہ نہ ہوتے تو اللہ کا دین قائم نہ ہوتا۔ اگر تم لوگ زمین میں نہ ہوتے تو آسمان کی طرف سے بارش نہ برستی۔ اے علیؑ! جنت میں تیرے لیے خزانہ ہے اور تو بہشت کا سردار ہے۔ تیرے شیعہ حزب اللہ کے نام سے مشہور ہوں گے۔ اے علیؑ! تو اور تیرے شیعہ عدل و انصاف قائم کرنے

والے ہیں اور تم لوگ اللہ کے بندوں میں برگزیدہ ہو۔

اے علیؑ! میں ہی وہ پہلا شخص ہوں جو اپنے سر سے مٹی جھاڑیگا۔ یعنی محشور ہوگا اور تو میرے ساتھ ہوگا اور پھر ساری مخلوق کی باری آئیگی۔ اے علیؑ! تو اور تیرے شیعہ حوضِ کوثر پر ہوں گے۔ تم جس کو پسند کروگے اسے سیراب کروگے اور جس کو ناپسند کروگے اس کو ہٹاؤگے۔ تم لوگ اس بڑی مصیبت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے ہوگے۔ اس دن اور لوگ خوفزدہ وغمگین ہوں گے لیکن تم لوگ نہیں۔

رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا کہ تمہارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: جن لوگوں کے واسطے ہماری طرف سے پہلے ہی سے بھلائی لکھی جا چکی ہے وہ دوزخ سے اتنا دور رکھے جائیں گے کہ اس کی بھنک بھی نہ سنیں گے۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنی من مانگی مرادوں میں رہیں گے اور ان کو قیامت کا بڑے سے بڑا خوف دہشت میں نہ لائے گا۔ فرشتے ان سے خوشی خوشی ملاقات کریں گے اور یہ خوشخبری دیں گے کہ یہی وہ تمہارا خوشی کا دن ہے جس کا دنیا میں تم سے وعدہ کیا گیا تھا[1]۔ (بحارالانوار جلد ۳۹ باب ۸۷)

۱۱۔ امام علیؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ہماری ولایت پر یقین رکھنے والے افراد اپنی قبروں سے نکلیں گے تو ان کے چہرے روشن ہونگے، ان کے ستر ڈھکے ہوئے ہوں گے۔ وہ لوگ خوف سے مامون ہوں گے۔ تکلیفیں ان سے دور کردی جائیں گی۔ ان پر قیامت کے مرحلے آسان کردیے جائیں گے۔ دوسرے لوگ خوف میں ہوں گے لیکن ان کو خوف

---

[1] سورۂ انبیاء۔ آیت ۱۰۲ تا ۱۰۴

نہیں ہوگا، دوسرے لوگ غمگینی میں ہوں گے لیکن ان کو کچھ غم نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو امن وامان دیا جائے گا اور دکھ ان سے دور کیے جائیں گے۔ ان لوگوں کو ایسے سفید اونٹوں پر سوار کرایا جائے گا جن کے پر بھی ہوں گے۔ ان کے پاؤں میں زری کے جوتے ہوں گے جن کے تسمے چمکدار ہوں گے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے نور کے منبروں پر بیٹھیں گے۔ ان کے سامنے ایک دسترخوان بچھا ہوگا اور وہ اس سے طعام کھائیں گے یہاں تک کہ اور لوگ اعمال کے حساب سے فارغ ہو جائیں گے۔

(بحار الانوار جلد ۶۸ باب فضائل الشیعہ)

۱۲۔۔۔ عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے فرمایا: میری اور میرے اہلبیتؑ کی ولایت دوزخ سے برأت و امن کا ذریعہ ہے۔ (بحار الانوار جلد ۲۷ باب ثواب حبہم ونصرہم وولایتہم)

غرض اس قسم کی اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں۔

اہلبیتؑ اور ان کے محبّوں کی فضیلت

اہلبیتؑ اور ان سے محبت کرنے والوں کی فضیلت کے بارے میں شیعہ و سنی سلسلہ ہائے سند سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں:

ابن مغازلی نے اپنی کتاب "مناقب علی ابن ابیطالبؑ" (صفحہ ۱۱۹) میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن کسی شخص کے پاؤں حرکت نہ کر سکیں گے، جب تک کہ اس سے چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ کر لیا جائے گا۔ اس کی عمر کے بارے میں کہ کس مشغلے میں گزری۔

اس کے جسم کے بارے میں کہ اسے کس کام میں مصروف کیا، اس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے کمایا اور کس مد میں خرچ کیا اور ہم اہل البیتؑ کی محبت کے بارے میں"۔ [1]

اسی کتاب کے صفحہ ۵۱ پر معاویہ ابن حیدۃ القشیری سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت علیؑ سے یہ کہتے ہوئے سنا: "اے علیؑ! جو شخص تم سے بغض رکھے ہوئے مرے گا وہ یہودیت پہ مرے گا یا نصرانیت پہ!"

نیز اسی کتاب میں ہے: حضرت ابن عباسؓ کی سند سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ جبرئیلؑ کو حکم دے گا کہ وہ بابِ جنت میں بیٹھ جائیں اور کسی کو اس میں داخل نہ ہونے دیں جبکہ اس کے پاس علی ابن ابیطالبؑ کی طرف سے برأت نامہ نہ ہو۔ (صفحہ ۱۳۱)

نیز ابن مغازلی اپنی اسی کتاب میں زہری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا: قسم ہے اللہ کی جس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "مومن کے نامۂ اعمال کا عنوان محبتِ علی ابن ابیطالبؑ ہے۔" (صفحہ ۲۴۳)

---

[1] اس حدیث کو علامہ شیخ مہدی حائری نے "کوکبِ دری" میں ثعلبی، ابی القاسم قشیری اور ابن بطہ کے حوالوں سے نقل کیا ہے اور یہ تمام حضرات علمائے اہلسنت میں سے ہیں۔ علامہ قندوزی نے اسے ینابیع المودۃ (صفحہ ۱۱۲-۱۱۳) میں نقل کیا ہے۔

اور امیر المومنینؑ سے ابن مغازلی نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: "تم جہنم کے بانٹنے والے ہو۔ تم جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ گے اور بے حساب اس میں داخل ہو گے۔" (صفحہ ۶۷)

اور علامہ قندوزی حنفی نے "ینابیع المودۃ" میں ابن عمر کی روایت میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا: "تم جنت وجہنم کے بانٹنے والے ہو۔" (صفحہ ۸۳-۸۴)

ابن مغازلی نے ثمامہ ابن عبداللہ ابن انس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اپنے باپ اور دادا کے حوالے سے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب قیامت کا دن ہوگا اور جہنم کے کنارے پر صراط نصب ہوگا تو اس پر سے کوئی پار نہ ہو سکے گا۔ مگر وہ جس کے پاس ولایتِ علی ابن ابیطالبؑ کا پروانہ ہوگا۔" (کتاب المناقب صفحہ ۲۴۲)

مصنف مذکور ہی نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "علیؑ قیامت کے دن حوض کوثر کے پاس ہوں گے اور کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ مگر وہ جو علی ابن ابیطالبؑ کا اجازت نامہ پیش کریگا۔ (صفحہ ۱۱۹)

اسی کتاب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی سند سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: "اے علیؑ! تمہارا دوست میرا دوست ہے اور تمہارا دشمن میرا دشمن ہے۔" (صفحہ ۱۹۶)

اسی کتاب میں زر ابن جیش کی روایت سے ہے کہ امام علیؑ

نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات گرامی کی جس نے دانے کو نشوونما دی اور جاندار کو زندگی دی کہ نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ مجھ سے عہد وپیمان ہے کہ (اے علی ؑ!) تم سے محبت نہیں کریگا مگر مومن اور تم سے عداوت نہیں رکھے گا مگر منافق۔" (صفحہ ۱۹۰)

اور اسی کتاب میں حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: "قسم ہے اس ذاتِ گرامی کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد ؐ کی جان ہے کہ ہم اہلبیت ؑ سے جو بھی عداوت رکھے گا، اللہ اس کو اوندھے منہ جہنم میں دھکیل دے گا۔" (صفحہ ۱۳۸)

علامہ قندوزی نے اپنی کتاب "ینابیع المودۃ" (مطبوعہ بصیرتی ایران) میں مسند احمد ابن حنبل کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب ؑ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تلاش کیا تو مجھے ایک باغ میں سوتا ہوا پایا۔ پس مجھے جگاتے ہوئے فرمایا: اٹھو میں تم کو یقیناً راضی کرلوں گا۔ تم میرے بھائی ہو اور میرے بچوں کے باپ ہو۔ تم میری سنت پر رہتے ہوئے جنگ کروگے۔ جو میرے زمانے میں مرجائے وہ اللہ کے خزانے اور پناہ میں ہوگا۔ جو تمہارے عہد میں مرے تو اس نے بھی اپنا وقت پورا کرلیا اور جو تمہارے بعد تمہاری محبت پر مرے اللہ اس کا خاتمہ امن وامان پر کرے گا، جب تک طلوع وغروبِ آفتاب کا سلسلہ باقی ہے۔ (صفحہ ۱۲۴)

اسی کتاب میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بسلسلہ حضرت علی علیہ السلام مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا: جبرئیل امین نازل ہوئے اور کہا: "اے محمدؐ! اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ علیؑ سے محبت کریں اور ان لوگوں سے بھی محبت کریں جو علیؑ سے محبت کرتے ہیں۔" (ینابیع المودۃ)

اور اسی کتاب میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی سند سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اگر تمام لوگ محبت علی ابن ابی طالبؑ پر متفق ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا۔" (ینابیع المودۃ)

نیز علامہ قندوزی نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ہی کی سند سے یہ حدیث بھی روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: "تمہاری مثال تو قرآن مجید کے سورۂ قل ہو اللہ احد کی سی ہے کہ جس نے ایک مرتبہ پڑھ لیا تو گویا اس نے قرآن مجید کا ایک تہائی حصہ پڑھ لیا اور جس نے اسے تین مرتبہ پڑھ لیا اس نے گویا کہ پورا قرآن پڑھ لیا۔ اسی طرح اے علیؑ! جس نے تم سے محض دل سے محبت کی، اس نے ایمان کا ایک تہائی حصہ پا لیا، جس نے قلب و زبان دونوں سے تمہیں چاہا اس نے ایمان کے دو تہائی حصے پا لیے اور جو قلب و زبان اور ہاتھ (یعنی عمل) سب سے تمہاری محبت میں سرگرم رہا اس نے ایمان کے تمام حصے پا لیے۔ قسم ہے اس ذات گرامی کی جس نے مجھے حق کے ساتھ نبی مبعوث کیا ہے، اگر اہل زمین بھی تم سے اسی طرح محبت کرتے جیسے اہل آسمان تم سے محبت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کسی کو بھی آتش جہنم سے معذب نہ کرتا۔

(ینابیع المودۃ صفحہ ۱۲۵)

اسی کتاب میں طبرانی کے حوالے سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی مدحت میں قرآن مجید کی تین سو سے زیادہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ (ینابیع المودۃ صفحہ ۱۲۶)

ابن مغازلی نے "مناقب علی ابن ابیطالبؑ" (صفحہ ۱۳۲) میں ہارون الرشید، اس کے باپ مہدی، منصور، اس کے باپ اس کے دادا، پھر ابن عباس کے سلسلہ سند سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میرے اہلبیتؑ کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے کہ جو اس میں سوار ہو گیا اس نے نجات پائی اور جو اس سے پیچھے رہ گیا وہ ہلاک ہو گیا۔"

اسی طرح حاکم حسکانی نے اپنی کتاب شواہد التنزیل جلد ا صفحہ ۴۲۶ میں ابو عثمان سعید ابن محمد جبری، احمد ابن اسحاق جبری، جعفر ابن سہل، ابو زرعہ اور عثمان ابن عبداللہ قرشی، ابن لہیعہ، ابوالزبیر، پھر حضرت جابر کے سلسلہ سند سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اگر میری امت کے لوگ اتنے روزے رکھیں کہ سوکھ کر میخ کی طرح ہو جائیں اور اتنی نمازیں پڑھیں کہ خمیدہ ہو جائیں، پھر بھی (اے علیؑ) اگر وہ تم سے عداوت رکھیں تو اللہ ان کو منہ کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔"

صاحب "مجمع البیان" نے حسکانی کی اس روایت کو تو نقل کیا ہے مگر وہاں 'جبری' کے بجائے 'حمیری' ہے۔ علاوہ بریں علامہ حسکانی نے اس حدیث کو ایک دوسری سند سے بھی لکھا ہے۔ (صفحہ ۴۲۸)

نیز انہوں نے ابو سہل جامعی، ابو حفص عمر ابن احمد، ابوالحسن

نمل ابن عبداللہ ابن علی صوفی، ابو اسحاق ابراہیم ابن حسین تستری، حسن ابن ادریس حریری، ابو عثمان جحدری، فضال ابن جبیر۔ پھر ابوامامہ باہلی کے سلسلۂ سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "یقیناً اللہ نے دوسرے نبیوں کو مختلف شجروں سے پیدا کیا۔ مگر مجھے اور علیؑ کو ایک ہی شجرہ سے پیدا کیا۔ میں اس کی اصل ہوں، علیؑ اس کی فرع ہیں۔ حسنؑ وحسینؑ اس کے پھل ہیں اور ہمارے شیعہ اس کے پتے ہیں۔ پس جو شخص اس شجرہ کی کسی ایک شاخ سے وابستہ ہو گیا، اس نے نجات پائی اور جو منحرف ہوا ہلاک ہوا۔

اگر کوئی عبادت کرنے والا خدا کی عبادت کرتا رہے ہزار سال، پھر ہزار سال اور پھر ہزار سال تک، مگر وہ ہم سے محبت نہ کرے تو اللہ اس کو اس کے نتھنوں کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

"اے رسولؐ! کہہ دیجیے کہ میں تم سے تبلیغ دین کا کوئی صلہ نہیں مانگتا اس کے سوا کہ تم میرے قریب ترین عزیزوں سے محبت کرو۔"[1] (سورۂ شوریٰ۔ آیت ۲۳)

---

[1] ابن حجر ہیثمی نے احمد، طبرانی، ابن ابی حاتم اور حاکم کے حوالوں سے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی یہ روایت لکھی ہے کہ جب آیت مودّت نازل ہوئی تو لوگوں نے سوال کیا: یا رسول اللہؐ وہ آپ کے قرابتدار کون ہیں جن سے محبت رکھنا ہم پر واجب ہے؟ تو آنحضرتؐ نے فرمایا: "وہ علیؑ فاطمہؑ اور ان کے دونوں فرزند ہیں۔" ابن حجر نے اس معنی کی اور بھی کئی حدیثیں لکھی ہیں۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۱۶۹)

اس طرح کی متعدد دوسری احادیث و روایات فریقین کی سندوں سے بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ جار اللہ زمخشری نے کیا خوب کہا ہے:

ترجمہ شعر ۱

شک و اختلاف بہت بڑھ چکا ہے اور ہر ایک صراط مستقیم کو حاصل کر لینے کا دعویدار ہے۔

ترجمہ شعر ۲

اس حالت میں میرا سہارا اس ذات سے ہے جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ پھر میرا سہارا محمدؐ و علیؑ کی محبت ہے۔

ترجمہ شعر ۳

اصحاب کہف کا کتا بھی ان کی محبت کی وجہ سے کامیاب ہو گیا تو میں آلِ نبیؐ سے محبت کر کے کیسے ناکام ہو سکتا ہوں۔

(منقول از کشکول شیخ بہائی رحمۃ اللہ)

شفاعت اہل بیتؑ

وہ چیزیں جو یوم قیامت کے فزع اکبر سے نجات دلانے والی ہیں ان میں سے ایک شفاعت ہے۔ حاکم حسکانی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ان کے آباؤ طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۰۱، ۱۰۲ "پس نہیں ہے ہمارے لیے کوئی شفاعت کرنے والا اور نہ کوئی حمایتی" کی تفسیر میں یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "یہ آیت ہمارے مخالفین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب بروز قیامت اللہ ہمیں فضیلت عطا فرمائے گا اور ہمارے شیعوں کو یہ فضیلت دے گا کہ وہ ہماری شفاعت سے سرفراز ہوں گے تو اسے دیکھ کر ہمارے مخالفین کہیں گے: ہمارا تو نہ

کوئی حمایتی ہے نہ دوست ہے"۔ (شواہد التنزیل جلد ا صفحہ ۲۱۸)

اور حافظ سلیمان ابن ابراہیم قندوزی حنفی نے اپنی کتاب "ینابیع المودۃ" میں اس آیت "جنت و جہنم کے درمیان بلند مقامات پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے۔"

(سورۂ اعراف۔ آیت ۴۶)

اس کی تفسیر میں اصبغ ابن نباتہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا: "میں حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ابن الکوا آیا اور اس نے آپ سے اسی آیت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: "وائے ہو تجھ پر اے ابن الکوا! یہ ہم ہوں گے جو قیامت کے دن جنت و جہنم کے درمیان کھڑے ہوں گے۔ پس جو ہمارا دوست ہوگا ہم اسے پہچان لیں گے اور اسے جنت میں داخل کریں گے اور جو ہمارا دشمن ہوگا ہم اس کو بھی پہچان لیں گے اور اسے جہنم کی طرف بھیج دیں گے۔"

(صفحہ ۱۰۲ مطبوعہ بصیرتی طہران)

حافظ ابن مغازلی نے اپنی کتاب "مناقب علی ابن ابیطالب" صفحہ ۲۳۷ میں حضرت جابر ابن عبداللہ انصاری کی سند سے لکھا ہے کہ جب حضرت علی ابن ابیطالبؑ خیبر کو فتح کر کے واپس آئے تو پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا: "اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ میری امت کے کچھ لوگ تمہارے بارے میں بھی وہی بات کہنے لگیں جو عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کہتے ہیں تو میں تمہارے بارے میں وہ بات کہہ دیتا (یعنی وہ فضیلت بیان کر دیتا) جس کے بعد تم مسلمانوں کے جس گروہ کے پاس سے گزرتے وہ تمہارے پیروں کے نیچے کی خاک اٹھاتے اور تمہارے وضو کا پانی لیکر ان سے

شفا حاصل کرتے۔ لیکن یہ فضیلت بھی تمہارے لیے کافی ہے کہ تم کو مجھ سے وہی منزلت حاصل ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے حاصل تھی۔ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ تم ہی میری ذمہ داریاں پوری کرو گے، میری میت کو دفن کرو گے اور میری سنت پر جہاد کرو گے۔ پھر کل یوم قیامت تم تمام خلائق میں مجھ سے زیادہ قریب ہو گے اور تم ہی حوضِ کوثر پر میرے نائب ہو گے۔ تمہارے شیعہ نورانی منبروں پہ روشن چہروں کے ساتھ میرے اردگرد ہوں گے میں ان کی شفاعت کروں گا اور جنت میں وہ میرے پڑوسی ہوں گے۔"

کون شافع اور کون مشفوع ہیں

شفاعت کے باب میں ویسے تو بہت سی آیتیں اور احادیث مختلف مضامین پر مشتمل وارد ہوئی ہیں۔ تاہم گفتگو حسب ذیل تین باتوں پر ہونی چاہیے۔

۱۔ شفاعت کرنے والے کون ہوں گے؟ اور ان کے اپنے طبقات کیا ہوں گے؟

۲۔ شفاعت کس امر میں واقع ہوگی؟ بلندیٔ درجات کے لیے یا گناہوں کی بخشش کے لیے؟

۳۔ مختلف گروہوں میں سے کونسے گروہ مستحقِ شفاعت ہوں گے؟

پس ہم گزارش کرتے ہیں کہ آیاتِ قرآنیہ و احادیثِ کثیرہ سے اس باب میں جو کچھ واضح ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ شفاعت کرنے والے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام علمائے حق، شہداء اور وہ مومنین ہوں گے جن کی شفاعت کو قبول کرنے کا اللہ نے وعدہ کیا ہے۔ یہ شفاعت امتِ مسلمہ

کے لیے ہوگی۔ خاتم الانبیاءؐ کی رسالت کا انکار کرنے والوں کے لیے کوئی شفاعت نہیں ہوگی اور شفاعت گناہوں کی بخشش کے لیے ہوگی، درجات کے لیے نہیں۔ جیسا کہ بعض ان لوگوں کا خیال ہے جو یہ کہتے ہیں کہ شفاعت مومنین اہل جنت کے لیے ہوگی، گناہگار مومنین کے لیے نہیں ہوگی۔ کیونکہ آیات واحادیث سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ شفاعت ان مومنین کے لیے ہوگی جو گناہگار و مستحق عذاب ہوں گے۔

اس مفہوم کے ثبوت کے لیے ہم چند آیات واحادیث پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

پروردگار عالم فرماتا ہے:

"اس دن کسی کی شفاعت کام نہیں آئے گی سوائے ان لوگوں کی شفاعت کے جن کو رحمٰن اجازت دے گا اور ان کی بات سے راضی ہوگا۔"

(سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱۰۹)

علامہ طبرسی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس دن کسی کی شفاعت کسی کے حق میں سودمند نہیں ہوگی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ شفاعت کرنے کی اجازت دے گا اور ان کی بات سے راضی ہوگا۔ انبیاءؑ اولیاءؑ، صالحین، صدیقین اور شہداء میں سے۔ (بحارالانوار جلد ۸ صفحہ ۳۲)

اور علامہ مجلسیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مفسر قمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا انبیاء و مرسلین میں سے کوئی بھی اذنِ خدا کے بغیر کسی کی شفاعت نہیں کرسکے گا۔ جہاں تک رسول اللہؐ کا تعلق ہے تو اللہ نے ان کو یوم قیامت

سے پہلے ہی اذن شفاعت دے رکھا ہے۔ یہ حق شفاعت ان کے لیے بھی ہے اور ان کی ذریت کے ائمۂ معصومین علیہم السلام کے لیے بھی ہے دوسرے انبیاء کے لیے حق شفاعت کا درجہ ان حضرات کے بعد ہے۔

(بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۳۸)

علاوہ بریں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"(اے رسولؐ!) قریب ہے کہ آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود پر مبعوث فرمائے۔" (سورۂ اسراء۔ آیت ۷۹)

اس آیت کی تفسیر بالاتفاق یہی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرتؐ کو ان کی امت کے بارے میں حق شفاعت عطا فرمائے گا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اس دن سے ڈرو کہ جس دن کوئی شخص کسی کی طرف سے کچھ نہ کر سکے گا۔ نہ کسی کی طرف سے کوئی سفارش مانی جائے گی نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کو مدد مل سکے گی۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۸)

اس آیت کے بارے میں تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے: پس ہمارے نزدیک گناہگار مومنوں میں سے جو عذاب و خسارت کے مستحق ہو چکے ہیں یہ شفاعت ان کو اس خسارے سے بچانے اور عذاب الٰہی کو ٹالنے کے لیے مخصوص ہے۔

تفسیر تبیان میں مذکور ہے: "نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش مانی جائے گی۔" ہمارے نزدیک یہ بات کفار کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ شفاعت کسی کو نفع دلانے کے لیے نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا پیغمبر اکرمؐ مومنوں

کے حق میں شفاعت کریں گے، اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت قبول کریں گے اور مستحق عذاب نمازگزاروں سے بھی عذاب ٹل جائے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضور اکرمؐ نے فرمایا: "میں نے اپنی امت کے اہل کبائر کے لیے اپنا حق شفاعت ذخیرہ کر رکھا ہے"۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ نفع کو بڑھانے کے لیے شفاعت کے مورد قبول نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ اگر اس معاملہ میں بھی شفاعت کی جائے تو خود حضور اکرمؐ کے حق میں ہم میں سے کسی کا شفیع ہونا ممکن ہو جائے گا۔ کیونکہ انہوں نے بھی ازدیاد کرامت کے لیے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا اور یہ بات اجماع امت کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہو گئی کہ شفاعت صرف دفع خسارت وعقوبات کے لیے مخصوص ہے اور ثبوت شفاعت سے یہ بھی واضح طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ آیت مذکورہ میں اہل قبلہ کے لیے شفاعت کی نفی نہیں ہوئی بلکہ یہ کفار سے متعلق ہے جیسا کہ علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ کی مشہور تفسیر "المیزان" میں بھی اس کی یہی توضیح کی گئی ہے۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو وہ اس باب میں تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ مثلاً ارشاد نبوی ہے:

"یقیناً میری امت میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی شفاعت سے اللہ قبیلہ مضر کے لوگوں سے زیادہ لوگوں کو جنت میں داخل کریگا۔ (بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۳۴)

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"ہر نبی کی ایک دعا اور ایک سوال ہوتا ہے، جو دوسرے انبیاءؑ کر چکے مگر میں نے اپنی دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لیے

محفوظ رکھا ہے۔" (بحار الانوار ۸ صفحہ ۳۴)۔

ارشاد نبوی ہے: "تین قسم کے لوگ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں شفاعت کریں گے تو ان کی شفاعت قبول ہوگی۔ انبیاء، علماء اور شہداء"

(حوالۂ مذکور)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "تم لوگ اپنے اعمال سے ہمیں قیامت کے دن شفاعت کے معاملے سے دو چار نہ کرو"

(حوالۂ مذکور)

اور امیر المومنینؑ ہی کا ارشاد ہے: "ہمیں بھی حق شفاعت حاصل ہوگا اور ہم سے مودت کرنیوالوں کو بھی" (حوالۂ مذکور)

اور جناب امیرؑ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "جو میرے حوض کوثر پر ایمان نہ رکھتا ہو، اللہ اسے وہاں وارد نہ کرے اور جو میرے حق شفاعت پر ایمان نہ رکھے اللہ اسے میری شفاعت نصیب نہ کرے" پھر فرمایا: میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لیے ہوگی جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہونگے۔ جہاں تک حسن عمل کرنیوالوں کا تعلق ہے تو انہیں اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔ (حوالہ مذکور)

اور حسین ابن خالد کا بیان ہے کہ میں نے امام رضا علیہ السلام سے کہا: اس قول خداوندی کا کیا مطلب ہے: "وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر ان کی جن کو اللہ پسند کریگا۔" (سورۂ انبیاء۔ آیت ۲۸) تو امامؑ نے فرمایا: "یعنی اللہ جن کے دین کو پسند کریگا۔" (حوالہ مذکور)

طبرسی قدس اللہ روحہ، نے اپنی تفسیر "مجمع البیان" میں اس آیت "اور مجرموں کو ہم جہنم کی طرف ہانک دینگے۔ وہ کوئی شفاعت نہ رکھتے ہونگے

سوائے ان کے جنہوں نے رحمٰن سے کوئی عہد کیا ہوگا۔" (سورۂ مریم۔آیت ۸۷) کے ذیل میں لکھا ہے: "یعنی نہ وہ کفار کسی دوسرے کی شفاعت کرسکیں گے۔ جبکہ اہل ایمان ایک دوسرے کی شفاعت کریں گے اور رحمٰن کے ساتھ عہد کا مطلب ایمان لانا ہے۔ یعنی خدا کی وحدانیت اور انبیاؑء کی تصدیق کرنا۔" (بحارالانوار جلد ۸ صفحہ ۳۱)

اور ابو بصیر ہی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "ہمارے شیعہ اللہ کے نور سے پیدا کیے گئے ہیں اور اسی کی طرف وہ لوٹ کر جائیں گے۔ خدا کی قسم! تم لوگ ہم سے قیامت کے دن ملحق ہوگے۔ ہم تمہاری شفاعت کریں گے جو قبول ہوگی۔ تم میں سے ہر ایک کے لیے اس کے بائیں طرف جہنم بلند ہوگا اور دائیں طرف جنت ہوگی۔ پس وہ اپنے دوستوں کو جنت میں داخل کریگا اور دشمن کو جہنم میں ڈال دے گا۔" (بحارالانوار جلد ۸ صفحہ ۳۷)

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے روایت ہے کہ فرمایا: "بخدا ہم یقیناً شفاعت کریں گے، بخدا ہم یقیناً شفاعت کرینگے اپنے شیعوں میں گناہگاروں کی۔ یہاں تک کہ جب ہمارے دشمن اسے دیکھیں گے تو حسرت سے کہیں گے: ہمارا تو نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہے نہ کوئی حمایتی دوست۔ پس کاش! ہمارے لیے (دنیا کی طرف) پلٹنا ممکن ہوتا تو ہم بھی مومنین میں سے ہوتے۔" (سورۂ شوریٰ آیت ۱۰۰ تا ۱۰۲ بحوالہ بحارالانوار جلد ۸ صفحہ ۳۸)

نیز امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: "یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے ان کی امت کے بارے میں حق شفاعت ہوگا اور

ہمارے لیے شیعوں کے بارے میں حق شفاعت ہوگا۔ پھر ہمارے شیعوں کے لیے ان کے اہل وعیال کے لیے شفاعت کا حق ہوگا۔

(بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۳۸)

صراط

لغوی اعتبار سے لفظ صراط کے معنی ہیں راستہ، چنانچہ قاموس میں ہے کہ "صراط یعنی راستہ یا وہ راستہ جو برابر ہو اور اس میں کوئی کجی نہ ہو۔"

اور شرعی اعتبار سے صراط دو قسم کے ہیں۔ صراط دنیا اور صراط آخرت، صراط دنیا سے مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے پسندیدہ دین کی معرفت بطریق صحیح۔ پھر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی اطاعت و پیروی۔ قرآن مجید میں ہے:

"(اے اللہ!) تو ہمیں (سیدھے) راستے کی ہدایت دے۔"

(سورۂ حمد۔ آیت ۶)

یعنی اس دین کی ہدایت جس کے سوا کوئی اور دین قابل قبول نہیں ہوگا اور خدا نے فرمایا:

"یقیناً میرا سیدھا راستہ ہے۔ پس تم لوگ اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ پڑو کہ وہ تمہیں متفرق و منتشر کر دیں۔" (سورۂ انعام۔ آیت ۱۵۳)

جہاں تک صراط آخرت کا تعلق ہے تو وہ جہنم کے اوپر ایک پل ہے جس پر سے تمام لوگ گزریں گے اور اس مقام پر ہماری گفتگو کا موضوع وہی ہے۔ قیامت کے دن اس پل پر سے گزرنا بھی حساب

کتاب کا ایک حصّہ ہے۔ پس وہ لوگ جو اس پر سے بآسانی گزرنے کی قدرت رکھتے ہوں گے، وہ وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اہل ایمان اور نیکوکار رہے ہوں گے۔ وہ اس پر سے گزر کے جنت میں چلے جائیں گے اور وہ لوگ جو اس پل پر سے نہ گزر سکیں گے وہ کفار اور بدکار ہوں گے، وہ اس پر سے گر کے جہنم میں چلے جائیں گے۔

تفسیر امام علیہ السلام میں ہے کہ صراط مستقیم سے مراد دو راستے ہیں۔ ایک دنیا میں، دوسرا آخرت میں۔ دنیا کا صراط مستقیم وہ ہے جو غلو سے کمتر ہو اور تقصیر سے بلند تر ہو اور اتنا سیدھا ہو کہ باطل کی طرف ذرا بھی مائل نہ ہو اور آخرت کا صراط وہ سیدھا راستہ ہے جو مومنین کو براہ راست جنت تک پہنچائے گا۔ وہ نہ جہنم کی طرف مائل ہونگے نہ کسی اور طرف۔

(بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۷۰)

پُل صراط سے گزرنا

علامہ مجلسیؒ اسی مقام پر تحریر فرماتے ہیں: "صراط کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ حق ہے۔ وہ جہنم پر ایک پل ہو گا جس پر سے تمام لوگوں کا گزر ہو گا۔ ارشاد ربانی ہے:

"نہیں ہے تم میں سے کوئی مگر اس پر وارد ہونیوالا ہے۔
یہ تمہارے پروردگار کا حتمی فیصلہ ہے"

(سورۂ مریمؑ۔ آیت ۷۱)

اور صراط کے دوسرے معنی حجج اللہ ہیں۔ جو شخص دنیا میں ان کی معرفت حاصل کرے گا اور ان کی اطاعت کرے گا، اللہ اس کو قیامت کے دن پُل صراط پر سے بآسانی گزرنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔"

ارشاد ربانی ہے:

"یقیناً آپ کا رب کمین گاہ میں ہے۔" (سورۂ فجر۔ آیت ۱۴)

علامہ طبرسیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "یعنی وہاں سے تمام لوگوں کا گزر ہوگا اور ان کے اعمال میں سے کوئی چیز بھی نہیں چھوٹے گی۔ کیونکہ پروردگار ان کے تمام اقوال و اعمال کو سنتا اور دیکھتا ہے۔ گویا کہ وہ کمین گاہ میں بیٹھا ہے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "مرصاد (کمین گاہ) سے مراد صراط کا وہ پل ہے جہاں سے کوئی شخص ظلم کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔" اور آپ ہی کا ارشاد ہے: "صراط سے لوگ مختلف طبقات میں گزریں گے۔ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہوگا۔ پس کچھ لوگ تو بجلی کی سی تیزی سے اس سے گزر جائیں گے، کچھ گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے گزریں گے، کچھ لوگ کشتی کی سی رفتار سے گزریں گے اور کچھ لوگ اس طرح گرتے پڑتے گزریں گے کہ کہیں سے انہیں آگ پکڑے گی تو کہیں سے چھوٹ جائیں گے۔" (بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۶۴-۶۵)

نیز گزشتہ روایات میں آچکا ہے کہ قیامت کے دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام صراط کے پاس بیٹھیں گے اور وہاں سے کوئی بھی نہیں گزر سکے گا۔ مگر وہ جس کے پاس ولایت علیؑ کا اقرار نامہ موجود ہوگا۔

اور یہ ارشاد باری بھی مذکور ہو چکا ہے کہ:

"یقیناً وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ (سیدھے) راستے سے منحرف ہیں۔" (سورۂ مومنون۔ آیت ۷۴)

ابن شہر آشوب نے "المناقب" (جلد ۲ صفحہ ۱۵۵ طبع قم) میں محمد بن الصباح زعفرانی، مزنی، شافعی، مالک، حمید اور انس ابن مالک کے سلسلہ سند سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد ربانی: "پس وہ نہ چڑھ سکا دشوار گزار پہاڑی راستے پر" (سورۃ بلد۔ آیت ۱۱) کے بارے میں فرمایا: "صراط پر ایک نہایت سخت اور دشوار گزار راستہ ہوگا۔ جس کی مسافت تین ہزار سال ہوگی۔ ایک ہزار سال اترنے کے، ایک ہزار سال کانٹوں، بچھوؤں اور سانپوں سے نپٹنے کے اور ایک ہزار سال چڑھنے کے۔ پس سب سے پہلے اسے عبور کرنیوالا ہونگا۔ دوسرے علی ابن ابیطالبؑ ہوں گے۔ اس کو محمدؐ و اہلبیت محمدؑ کے سوا کوئی بلا مشقت طے نہ کر سکے گا۔"

امیر المومنینؑ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

"اے لوگو! جان لو کہ تمہیں صراط پر سے گزرنا ہے جو نہایت سخت پھسلنے والا اور نہایت خوفناک راستہ ہوگا۔"

(بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۶۷)

شیخ صدوقؒ اپنی کتاب "فضائل الشیعہ" میں امام جعفر صادقؑ سے انکے آباء طاہرینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم لوگوں میں سے صراط پر زیادہ ثابت قدم وہی ہوگا جو میرے اہل بیتؑ سے زیادہ محبت کرنے والا ہوگا۔"

اسی کتاب میں امام محمد باقر علیہ السلام کی روایت ان کے آباء طاہرینؑ کی سند سے ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: "جس مرد مومن کے دل میں تمہاری محبت جگہ کر لے گی اس

کا کوئی قدم اگر صراط پر ڈگمگایا بھی تو دوسرا سنبھل جائے گا۔ یہاں تک کہ اللہ اس کو تمہاری محبت کی وجہ سے جنت میں داخل کرے گا۔

(بحوالہ بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۶۷-۶۹)

اعراف اور طفل و مجنوں

ارشاد خداوندی ہے:

"اور ان دونوں (یعنی جنت و جہنم) کے درمیان ایک پردہ ہوگا اور اعراف پر کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے۔"

(سورۂ اعراف - آیت ۴۶)

اعراف جمع عرف کی ہے جس کے لغوی معنی ہیں ریت کے ٹیلے۔ یہاں اعراف سے مراد جنت و جہنم کے درمیانی پردے کا بالائی حصہ ہے جہاں سے دونوں طرف دیکھا جا سکے گا۔

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو اعراف پر ہوں گے تو مفسرین میں ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ یہاں تک کہ دس اقوال پائے جاتے ہیں تاہم ان سب کو تین اقوال میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

اول یہ کہ وہ منزل و کرامت رکھنے والے لوگ ہوں گے۔ اگرچہ یہاں اختلاف ہے کہ وہ انبیاءؑ ہوں گے یا آل محمد علیہم السلام ہونگے۔ جن کی یہ خصوصیت ہے کہ جنت میں وہی داخل ہوگا جو ان کی معرفت رکھتا ہوگا اور وہ اسے پہچانتے ہوں گے اور جو ان کی معرفت سے محروم ہوگا اور جس کا وہ حضرات انکار کریں گے وہ جہنم میں جائے گا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: اعراف

جنت و جہنم کے درمیان واقع ٹیلوں کا نام ہے، جہاں ہر نبی اور ہر خلیفہ نبی اپنے زمانے کے گنہگاروں کو لے کر کھڑا ہوگا۔ جیسے امیر لشکر اپنے کمزور سپاہیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔" (تفسیر المیزان جلد ۸ صفحہ ۱۳۰ - ۱۴۳)

باب شفاعت اہل بیتؑ میں ابوالقاسم حسکانی کی یہ روایت گزر چکی ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام سے ابن الکواء نے اسی آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: "وائے ہو تجھ پر اے ابن الکواء، قیامت کے دن ہم جنت و جہنم کے درمیان کھڑے ہوں گے۔ پس جو ہماری مدد کرے گا ہم اسے اس کی نشانی سے پہچان لیں گے اور اسے جنت میں داخل کریں گے اور جو یہاں ہمارا دشمن ہوگا اسے بھی ہم اس کی نشانی سے پہچان لیں گے اور اسے جہنم میں بھیج دیں گے۔"

ہم نے جو کچھ ذکر کیا اس سے یہی مطلب نکلتا ہے کہ مقام اعراف پر کھڑے ہونے والے جو جنت و جہنم دونوں پر نگاہ رکھیں گے اور ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے وہ صاحبان منزل و کرامت حضرت محمدؐ اور آلِ محمد علیہم السلام ہوں گے۔ یہ پہلے قول کا خلاصہ ہے۔

"دوسرا قول یہ ہے کہ مقام اعراف پر مردوں کی صورت میں ملائکہ کھڑے ہوں گے جو اہل جنت اور اہل جہنم دونوں کو پہچانتے ہوں گے یا یہ کہ لوگوں کے اعمال کے گواہ ہوں گے۔ اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اگرچہ ملائکہ ہوں گے۔ مگر مردوں کی صورت رکھتے ہوں گے۔"

(تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۲۳)

اور تیسرا قول یہ ہے کہ وہ اعراف پر کھڑے ہونیوالے لوگ ایسے ہونگے جن کا نیکی اور بدی میں سے کسی جانب کوئی رجحان نہیں ہوگا۔ مثلاً

بے عقل اور مجنوں لوگ ــــ زمانۂ فترت میں ہونیوالے ناسمجھ بوڑھے بوڑھیاں اور کفار کے بچے وغیرہ۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے کفر و ایمان میں سے کسی کو بھی نہیں سمجھا۔

"حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اعراف میں ایسے لوگوں کو سکونت عطا فرمائے گا جو اپنے اعمال سے ثواب کے مستحق نہ ہوں گے۔ مگر وہ عذاب و عقاب کے بھی مستحق نہ ہوں گے۔ لہٰذا وہ شفاعتِ رسول ؐ اور شفاعتِ ائمہ ؑ کے منتظر ہوں گے۔ یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو جائیں گے اور یہ بھی کہا گیا کہ اعراف ایسے لوگوں کا مسکن ہوگا جو دنیا میں مکلّف نہیں تھے۔"

اس بنا پر استحقاقِ ثواب و عقاب نہ رکھنے والوں میں بے عقل، مجنوں، کفار کے بچے، ناسمجھ بوڑھے اور زمانۂ فترت کے لوگ ہوں گے۔

کفار کے ناسمجھ بچّے

کفار کے ناسمجھ بچوں کے لیے بھی وارد ہوا ہے کہ وہ اہلِ جنت کے خادموں میں سے ہوں گے اور اس طرح وہ جنت میں ہوں گے کیونکہ ارشادِ باری ہے:

"اللہ کی پیدا کردہ فطرت جس پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا۔"

اور ارشادِ رسول ؐ ہے:

"ہر پیدا ہونیوالا انسانی بچہ فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے۔"

پھر ان بچوں سے کوئی امرِ موجبِ عذاب بھی صادر نہ ہوا ہوگا۔ مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اعراف میں ہوں گے اور یہ بھی کہ وہ اپنے ماں باپ

کے ساتھ جہنم میں ہوں گے۔ مگر اس کی حرارت سے اذیت نہ پائیں گے۔ کچھ لوگوں نے اطفال کفار کے بارے میں توقف اختیار کیا ہے اور ان کے معاملے کو خدا کے حوالے کیا ہے۔ کچھ دوسروں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں اپنے علم کے مطابق عمل کرے گا۔ اگر وہ مستحق عذاب ہوں گے تو انہیں عذاب دے گا، ورنہ نہیں۔

اس مضمون کی متعدد حدیثیں وارد ہوئی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو آزمانے کا مذکورہ عمل عالم برزخ میں واقع ہو کیونکہ عالم قیامت تو دارِ جزا ہے اور دارِ تکلیف نہیں ہے۔ بہرطور اللہ ان کے حال سے واقف ہے۔

جہاں تک مومنین کے بچوں کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ جنت میں داخل ہوں گے اور اس پر کتاب و سنت کے دلائل بھی ہیں۔ رب العزت فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی، ہم ان کی اولاد کو ان سے ملحق کر دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔"

(سورۂ طور۔ آیت ۲۱)

اور تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ "ذریت سے مراد مومنین کے چھوٹے بچے ہیں اور بڑے بچے نہیں، کیونکہ بڑے بچے تو خود اپنے ایمان سے اپنے والدین کی پیروی کرتے ہیں جبکہ چھوٹے بچے والدین کے ایمان سے ان کی پیروی کرتے ہیں۔ لہٰذا بچے پر ان کے والدین کے لحاظ سے اسلام کا حکم جاری کیا جاتا ہے اور ملحق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم جنت میں ان کو ان کے والدین کے درجے میں رکھیں گے، جیسے وہ دنیا میں تھے۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ چھوٹے بچوں کو ان کے والدین کا درجہ دراصل ان کے والدین کی تکریم کے لیے دیا جائے گا۔"

(مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۱۶۵)

محقق طوسیؒ نے اپنی کتاب "تجرید الاعتقاد" میں تحریر فرمایا ہے: "غیر مکلف کو عذاب دینا قبیح ہے۔" (بحوالہ حق الیقین جلد ۲ صفحہ ۱۰۴)

نیز کافی میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ان کے آباء طاہرینؑ کی سند سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "خوبصورت بانجھ عورت سے نکاح نہ کرو۔ کیونکہ میں قیامت کے دن دوسری امتوں کے مقابل تم پر فخر کروں گا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ (مومنین کے) بچے عرش رحمٰن کے نیچے ہوتے ہیں اور اپنے والدین کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ ان کی نگہداشت کرتے ہیں اور مشک وعنبر زعفران کے پہاڑ پر جناب سارہ ان کی تربیت کرتی ہیں۔" (حوالہ مذکور)

اور شیخ صدوق نے "الفقیہ" میں حدیثِ صحیح ابوبصیر سے روایت کی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "جب مومنین میں سے کسی کا بچہ مر جاتا ہے تو ملکوتِ سماوات وارض میں ایک منادی ندا کرتا ہے: آگاہ ہو کہ فلاں ابن فلاں مر گیا ہے۔ پس اگر اس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک یا ان کے گھر والوں میں سے کوئی مومن مر چکا ہوتا ہے تو وہ بچہ اسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے، غذا و تربیت کے لیے۔ ورنہ وہ جنابِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی تربیت میں دے دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے والدین یا گھر والوں میں سے کوئی پہنچ جاتا ہے تو وہ اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔"

حقیقتِ جنت

مخفی نہ رہے کہ آیات و احادیثِ کثیرہ متواترہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ جنت میں جو بے شمار نعمتیں ہوں گی وہ جسمانی طور پر محسوس کیے جانے کے قابل ہوں گی۔ یعنی جسمانی لذتیں ان سے حاصل ہوں گی۔ یہ عقیدہ ضروریاتِ دین میں سے ہے اور مسلمانوں میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا ہے۔ جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے جیسے ملاحدہ یا جنہوں نے اس کی تاویل کسی اور طرح پر کی ہے، ان کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ وہ آیاتِ قرآنیہ جن میں نعیم جنت کا ذکر ہے وہ صراحتاً اس جسم پر واقع ہوں گی جو عالمِ آخرت میں پلٹایا جائے گا۔

شیخ صدوقؒ کی کتاب "صفات الشیعہ" میں امام جعفر صادقؑ کا ارشادِ گرامی ہے کہ "وہ ہمارے شیعوں میں سے نہیں ہے جو ان چار چیزوں کا انکار کرے۔ معراج، سوالِ قبر، جنت اور جہنم کا وجود اور شفاعت۔"

(بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۱۹۶)

کتاب "تنبیہ الخاطر" میں مذکور ہے کہ ایک آدمی نے حضور اکرمؐ سے پوچھا: اے ابوالقاسم! کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ اہلِ جنت کھائیں گے اور پئیں گے؟ آپ نے فرمایا: "ہاں! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ہر ایک جنتی کو کھانے اور پینے میں ایک سو آدمیوں کی قوت عطا کی جائے گی۔"

اس آدمی نے پھر کہا: "اگر ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ کھانے والے کو قضاءِ حاجت کی ضرورت پیش آئے گی، حالانکہ جنت پاک جگہ ہے اور وہاں ناپاکی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" حضورؐ نے فرمایا: جنتی کے

بدن سے مشک و عنبر کی خوشبو والا پسینہ نکلے گا، جس سے اس کا پیٹ ہلکا ہو جائے گا۔ (بحار الانوار جلد ۸، باب الجنۃ و نعیمہا)

شیخ صدوقؒ کی طرح بعض علماء کی رائے ہے کہ اہل جنت میں سے ایک گروہ ہو گا جن کو اللہ تعالیٰ کی تسبیح، تقدیس اور تکبیر بیان کرنے کی نعمت عطا کی جائے گی اور وہ لوگ فرشتوں میں شمار ہوں گے۔ ایک اور گروہ ہو گا، وہ لوگ انواع و اقسام کی ماکولات، مشروبات، فواکہ، ازواج مطہرات، حور و غلمان، طرح طرح کے ریشمی ملبوسات اور بیش بہا تکیہ گاہوں سے سرفراز ہوں گے۔ اس گروہ کا ہر فرد اپنی خواہش کے مطابق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مستفید ہو گا۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اہل جنت میں کوئی ایسا گروہ نہیں ہو گا جو کھانے پینے وغیرہ کے بغیر تسبیح، تقدیس اور تکبیر باری تعالیٰ ہی سے لذت حاصل کرے گا۔ بلکہ ضروری ہے کہ ان کو ایسی نعمتیں ملیں جن کو حواس خمسہ جان سکیں۔ جیسا کہ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں: یوں کہنا کہ جنت میں انسان بھی ملائکہ کی طرح تسبیح، تقدیس اور تکبیر ہی سے تسکین حاصل کرے گا۔ یہ ایک ایسا قول ہے جو اسلام سے مغایرت رکھتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا مزعومہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں خدا کے اطاعت گزار بندے جنت میں جا کر فرشتے بن جائیں گے، جو طعام، آب اور زوجیت سے بے نیاز ہیں لیکن خدائے تعالیٰ نے قرآن میں ان کے اس قول کو باطل ٹھہرایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

"اس کے میوے سدا بہار اور ایسے ہی اس کی چھاؤں بھی، یہ بدلہ ہے ان لوگوں کا جو (دنیا میں) پرہیزگار تھے۔" (سورۃ رعد۔ آیت ۳۵)

"اس میں پانی کی نہریں ہیں جن میں ذرا بدبو نہیں۔"
(سورۂ محمدؐ۔ آیت ۱۵)

"وہ حوریں جو خیموں میں چھپی بیٹھی ہیں۔" (سورۂ رحمٰن۔ آیت ۷۲)

"اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہیں۔" (سورۂ واقعہ۔ آیت ۲۲)

"ہم بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے ان کی تزویج کردیں گے۔" (سورۂ دخان۔ آیت ۵۴)

"اور ان کے پہلو میں نیچی نظروں والی (شرمیلی) ہم عمر بیویاں ہوں گی۔" (سورۂ صٓ۔ آیت ۵۲)

"بہشت کے رہنے والے اور ان کی بیویاں آج (روزقیامت) ایک نہ ایک مشغلہ میں جی بہلا رہے ہیں۔"
(سورہ یٰسٓ۔ آیت ۵۵-۵۶)

انہیں ملتی جلتی صورت و رنگ کے (میوے) ملا کریں گے اور بہشت میں ان کے لیے صاف ستھری بیویاں ہوں گی۔"
(سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵)[1]

ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے تو اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے عالمِ آخرت میں مومنین کے لیے ایک گھر بنایا ہے جس کا نام اس نے جنت رکھا ہے، وہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو دنیا میں اس کے احکام کی پابندی کرتے رہے۔ لہٰذا خالق و موجدِ عالم کی بے پناہ قدرت کو ذہن میں رکھتے ہوئے جنت کی مذکورہ خصوصیات کے بارے میں ہرگز کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

---

[1] بحوالہ بحار الانوار جلد ۸ باب الجنۃ ونعیمہا

خلقتِ جنت وجہنم

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ آیا جنت وجہنم دونوں اپنے اپنے مقامات پر خلقت شدہ موجود ہیں یا یہ کہ یہ دونوں چیزیں قیامت میں پیدا ہونگی تو جمہور مسلمین کا یہی عقیدہ ہے کہ یہ دونوں اس زمانے میں بھی موجود ہیں۔ تاہم معتزلہ میں سے ابوہاشم اور قاضی عبدالجبار اور ان کے متبعین نے یہ قولِ شاذ اختیار کیا ہے کہ وجود جنت وجہنم پر جو دلیلیں دی جاتی ہیں وہ ناکافی ہیں اور بعض نے تو فی الحال ان چیزوں کے وجود کو محال قرار دیا ہے۔ لیکن آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ متواترہ ان کے خیال کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں اور فرقۂ حق پرست میں سے کوئی بھی ان کی رائے کی طرف مائل نہیں ہوا ہے۔

شیخ صدوقؒ تحریر فرماتے ہیں: یقیناً جنت وجہنم اس وقت بھی موجود ہیں۔ احادیث معصومینؑ اسی پر دلالت کرتی ہیں اور اہل شرع کا اسی پر اجماع ہے۔ اگرچہ معتزلہ، خوارج اور فرقۂ زیدیہ کے ایک گروہ نے اس قول کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے ان دونوں چیزوں کے فی الحال موجود ہونے کو ممکنات میں سے قرار دیا ہے، ان کا وجود ضروری تسلیم نہیں کیا ہے اور آیات واحادیث کے بارے میں توقف کیا ہے۔ جبکہ بعض نے ان کو فی الحال محال قرار دیا ہے۔

(اوائل المقالات صفحہ ۱۰۲-۱۰۳)

اور شیخ صدوقؒ اپنی کتاب "العقائد" میں فرماتے ہیں: "جنت اور جہنم کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں فی الحال مخلوق وموجود ہیں اور نبی کریمؐ بوقت معراج جنت میں داخل ہوئے اور

جہنم کو بھی دیکھا۔ ہمارا اعتقاد یہ بھی ہے کہ کوئی شخص دنیا سے نہیں جاتا۔ مگر یہ کہ وہ موت سے پہلے ہی جنت یا جہنم دیکھ لیتا ہے۔ مومن جب دنیا سے جانے لگتا ہے تو اسکے سامنے دنیاوی زندگی بھی بہترین صورت میں پیش کیجاتی ہے اور اسے آخرت کی زندگی میں اسکا مقام بھی دکھایا جاتا ہے۔ پھر اسے ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا موقع دیا جاتا ہے تو وہ آخرت کو پسند کر لیتا ہے۔ تب اس کی روح قبض کی جاتی ہے۔ عادۃً کہا جاتا ہے کہ "فلاں شخص اپنی جان دے رہا ہے" تو کوئی بھی انسان اپنی کوئی چیز جبر و قہر سے نہیں دیتا بلکہ اپنی مرضی سے دیتا ہے۔ جہاں تک حضرت آدم علیہ السلام کی جنت کا تعلق ہے تو وہ اسی دنیا کے باغوں میں سے کوئی باغ تھا۔ جہاں سورج طلوع اور غروب ہوتا تھا۔ وہ جنت الخلد نہیں تھی۔ کیونکہ اگر وہ جنت الخلد ہوتی تو وہ اس میں سے کبھی نہ نکلتے۔

(بحوالہ حق الیقین جلد ۲ صفحہ ۱۴۸)

علی ابن ابراہیمؒ اس آیت "اور یقیناً انھوں نے اس کو دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اترتے دیکھا" (سورۂ نجم۔ آیت ۱۳-۱۴) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ وہ ساتواں آسمان تھا اور جہاں تک ان لوگوں کے رد کا سوال ہے جو جنت و جہنم کے وجود سے انکار کرتے ہیں تو اس کے لیے یہ قول باری کافی ہے: "اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے"۔ (سورۂ نجم آیت ۱۵) یعنی سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے۔ معلوم ہوا کہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے اور اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے"۔

(بحوالہ بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۱۳۳)

ان ہی علی ابن ابراہیمؒ نے اپنے باپ کے حوالے سے ہروی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام علی رضا علیہ السلام سے کہا:

"فرزندِ رسولؐ! مجھے جنت و جہنم کے بارے میں خبر دیجیے۔ کیا یہ دونوں مخلوق اور موجود ہیں؟"

امام علیہ السلام نے فرمایا: "ہاں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو آپ جنت میں داخل ہوئے اور آپ نے جنت کو دیکھا۔" میں نے کہا: "کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں ابھی تقدیرِ الٰہی میں ہیں اور ابھی پیدا نہیں ہوئی ہیں۔" تو امام علیہ السلام نے فرمایا: "وہ لوگ نہ ہم میں سے ہیں، نہ ہم ان میں سے۔ جو شخص جنت و جہنم کے موجود ہونے سے انکار کرتا ہے، وہ نبی اکرمؐ اور ہم کو جھٹلاتا ہے۔ ایسے ہماری ولایت کا کوئی حصہ نہیں ملا اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہوگا۔"

پروردگار فرماتا ہے: "یہ وہی جہنم ہے جس کی مجرمین تکذیب کرتے تھے۔ وہ اس میں اور کھولتے ہوئے پانی میں پھرتے رہیں گے۔" اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے: "جب مجھے آسمان کی طرف بلند کیا گیا تو جبریلؑ نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے جنت میں داخل کیا اور مجھے اس کی کچھ تازہ کھجوریں دیں جنہیں میں نے کھایا جس سے نطفہ بنا اور جب میں خدیجہؑ کے پاس گیا تو اسی نطفے سے فاطمہؑ کی تخلیق ہوئی جو انسانی حور ہیں۔ اسی وجہ سے جب میں خوشبوئے جنت کا مشتاق ہوتا ہوں تو اپنی بیٹی کی خوشبو سونگھ لیتا ہوں۔" (بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۱۱۹)

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: جناب رسول اللہؐ حضرت فاطمہؑ کو اکثر و بیشتر بوسہ دیا کرتے تھے۔ ان کے باپ پر، ان کے شوہر پر اور ان کی اولاد پر تحیۃ و سلام ہو۔ حضرت عائشہ نے اس پر اعتراض کیا تو رسول اللہؐ نے فرمایا: "اے عائشہ! جب مجھے آسمان پر لے جایا گیا تو

میں جنت میں داخل ہوا۔ وہاں جبرئیل مجھے شجر طوبیٰ کے پاس لے گئے اور مجھے اس کا پھل دیا تو میں نے اسے کھایا۔ پس اللہ نے اسی کو میرے صلب میں نطفہ بنا دیا۔ پھر جب میں زمین پر آیا اور خدیجہ کے پاس گیا تو اس سے فاطمہؑ کی خلقت ہوئی۔ لہٰذا جب بھی میں فاطمہؑ کو بوسہ دیتا ہوں تو شجر طوبیٰ کی خوشبو ان میں محسوس کرتا ہوں۔

(بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۱۱۹)

جنت اور اس کی نعمتیں

وہ مومنین متقین جنہوں نے دنیا اور اس کی فانی نعمتوں کے ساتھ اللہ سے ابدی نعمتوں کا سودا کیا، اللہ نے ان کے لیے اس دارِ بقا میں ایسی ایسی انواع و اقسام کی نعمتیں اور لذتیں مہیا کر رکھی ہیں جن کی حقیقت اس دنیا کے لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس دنیا میں دارِ آخرت سے متعلق ہماری مثال ویسی ہے جیسے رحمِ مادر میں رہنے والا بچہ کہ بیرونی دنیا اور اس کی وسعتوں کے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آخرت اس کی وسعت اور اس کی نعمتوں کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں مجملاً بیان کیا گیا ہے:

"پس کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ (اللہ نے) ان کے لیے وہاں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک مہیا کی ہے۔"

(سورۃ سجدہ - آیت ۱۷)

اور عمومی طور پر جنت کی نعمتوں کو اللہ نے یوں بیان کر دیا ہے:

"ان (اہلِ جنت) کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔" (سورۃ ق - آیت ۳۵)

اور فرمایا:

"وہ لوگ اپنی دل پسند چیزوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔" (سورۂ انبیاء۔ آیت ۱۰۲)

خلاصہ یہ کہ وہ گھر ایسا ہے جہاں نہ کوئی محرومی ہوگی نہ کوئی کدورت، جہاں نہ کوئی حزن وملال ہوگا، نہ کمزوری، نہ بڑھاپا، نہ مرض نہ مشقت۔ بلکہ وہاں ہر ناپسندیدہ چیز سے سلامتی ومحفوظیت ہوگی۔ اسی وجہ سے اس کو دارالسلام کہتے ہیں۔ اہل جنت کے لیے صحیح معنوں میں اقتدار ہوگا۔ یعنی جس چیز کا وہ ارادہ کریں گے، اسے حاصل کر لینے پر انھیں پوری قدرت ہوگی۔ اسی لیے حدیث میں ہے: "اہل جنت بادشاہ ہوں گے۔"

اور اللہ تعالیٰ سورۂ دہر میں فرماتا ہے:

"اور اگر تم وہاں دیکھو، تو نعمتوں اور ملکِ کبیر کو دیکھو گے۔"

(سورۂ دہر۔ آیت ۲۰)

پس ہم یہاں جنت کی ان چند نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔

جنت کا کھانا پانی

اللہ تعالیٰ اہل جنت کے کھانے پینے کے بارے میں فرماتا ہے:

"اور وہاں تازہ پھل ہوں گے جن میں سے وہ جسے چاہیں گے چھانٹ لیں گے اور ان کی پسند کے مطابق پرندوں کے گوشت ہوں گے۔" (سورۂ واقعہ۔ آیت ۲۰-۲۱)

اور پھر فرماتا ہے: "بہت سے تازہ پھل ہونگے، جو نہ ختم ہونیوالے ہونگے، نہ ان سے روکا جائے گا۔" (سورۂ واقعہ۔ آیت ۳۳)

اور فرمایا:

"اس جنت میں تازہ پھل ہوں گے۔ کھجوریں اور انار ہوں گے" (سورۂ رحمٰن۔ آیت ۶۷)

اور فرمایا:

"ان کا رب ان کو شرابِ طہور پلائے گا"

(سورۂ دہر۔ آیت ۲۱)

اور فرمایا:

"اس (جنت) میں صاف پانی کی نہریں ہوں گی اور ایسے دودھ کی نہریں جس کا ذائقہ نہ بگڑے گا اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لیے باعث لذت ہوں گی"

(سورۂ محمدؐ۔ آیت ۱۵)

جنت میں بہت سے چشمے بھی ہوں گے اور ان میں سے ہر ایک کی لذّت وحلاوت جداگانہ ہوگی۔ مثلاً ایک کافوری چشمہ ہوگا۔ جس کے بارے میں ارشاد باری ہے:

"یقیناً نیکوکار لوگ وہ جام پئیں گے جس کا مزاج کافوری ہوگا" (سورۂ دہر۔ آیت ۵)

اور ایک چشمہ زنجبیل ہوگا جو سلسبیل کہلائے گا۔ ارشاد باری ہے:

"اور وہاں انہیں وہ جام پلایا جائے گا جس کا مزاج زنجبیلی ہوگا۔ وہ چشمہ جس کا نام سلسبیل ہوگا"

(سورۂ دھر۔ آیت ۱۷-۱۸)

اسی طرح ایک چشمہ تسنیم ہوگا۔

ارشاد باری ہے:

"اور اس جام کا مزاج تسنیم سے ہوگا۔ وہ چشمہ جس سے مقربین پئیں گے۔" (سورہ المطففین۔آیت ۲۷-۲۸)

ان تمام چشموں میں سب سے اہم نہر کوثر کی ہوگی جو عرش الٰہی کے نیچے سے رواں ہوگی۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ تر ہوگا۔ اس کے سنگریزے زبرجد، یاقوت اور مرجان کے ہوں گے۔ اس میں زعفران اگی ہوئی ہوگی اور اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگی۔ احادیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ وہ تحتِ عرش سے جنت تک رواں ہوگی اور زمین محشر میں اسی پہ نہایت عظیم حوض بنا ہوگا۔

لباس جنت

ارشاد باری ہے:

"اور ان لوگوں کو وہاں سونے کے کڑے پہنائے جائیں گے اور وہ سندس اور استبرق کے سبز لباس پہنے ہونگے۔"

(سورہ کہف۔آیت ۳۱)

پھر یہ ارشاد ہے:

"ان کا لباس ریشمی ہوگا۔" (سورہ حج۔آیت ۲۳)

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: "جب مومن اپنے جنت کے گھروں میں داخل ہوں گے تو ان کے سروں پر ملک وکرامت کا تاج رکھا جائے گا۔ انھیں سونے چاندی کے زیورات پہنائے جائیں گے۔ ان کے تاج کے نیچے یاقوت اور موتی کی لڑیاں ہونگی

اور مختلف رنگوں کے ستر جوڑے پہنائے جائیں گے جو سونے اور چاندی کے تاروں، موتیوں اور سرخ یاقوت سے مرصع ہوں گے۔"

(بحارالانوار جلد ۸ صفحہ ۱۲۸)

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "مومن کے ہر عمل نیک کا ثواب قرآن مجید میں مذکور ہے، سوائے نماز شب کے۔ کیونکہ اللہ نے اس کے ثواب کی عظمت و کثرت کے پیش نظر اس کا ثواب بیان نہیں کیا۔ بس یہ فرمایا:

"ان کے پہلو بستروں سے نا آشنا رہتے ہیں۔ وہ اپنے پروردگار کو خوف و طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں سے وہ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں۔ پس کوئی نہیں جانتا کہ ان کے لیے کس قدر آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کے رکھی گئی ہے۔ ان کے عمل کی جزا کے طور پر۔"

(سورۂ سجدہ۔ آیت ۱۶-۱۷)

پھر امامؑ نے فرمایا: "پروردگار اپنے مومن بندوں کے لیے ہر یوم جمعہ ایک کرامت رکھتا ہے۔ وہ بندۂ مومن کی طرف ایک فرشتے کو بھیجتا ہے، جس کے ساتھ ایک حلّہ ہوتا ہے۔ وہ فرشتہ باب جنت پر پہنچ کر اس کے نام سے اجازت طلب کرتا ہے۔ جب اس مومن کو اس کا پیغام پہنچتا ہے تو وہ اپنی ازواج سے کہتا ہے: "تم میرے اوپر سب سے اچھا لباس کونسا سمجھتی ہو؟" وہ جواب دیتی ہیں: "اے ہمارے سردار! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو جنت عطا کی ہے، یہ لباس جسے آپ کے پروردگار نے بھیجا ہے۔ اس سے بہتر تو ہم نے دیکھا ہی نہیں۔" پس وہ بندۂ مومن اسے زیب تن کر لیتا ہے اور وہ جہاں سے گزرتا ہے، ضیا پاشی کرتا

جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسی صورت سے وہ میدانِ حشر میں وارد ہوگا۔"

(بحارالانوار جلد ۸ صفحہ ۱۲۶)

قصرہائے جنت

ارشادِ ربانی ہے:

"اور اللہ تم کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور پاکیزہ مکانات میں جو جنات عدن میں ہوں گے۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔"

(سورۂ صف۔ آیت ۱۲)

یہ مفہوم قرآن مجید میں بار بار بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان کے لیے کمرے ہوں گے، جن کے اوپر بھی کمرے بنے ہوں گے اور نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔"

(سورۂ زمر۔ آیت ۲۰)

علامہ طبرسی نے اپنی تفسیر مجمع البیان میں لکھا ہے کہ "جنت کے قصروں کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔" جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وہ اپنے کمروں میں بے خوف ہوں گے۔"

(سورۂ سبا۔ آیت ۳۷)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنت میں نہریں بغیر کھدائی کے جاری ہیں گی۔ اور "مساکن طیبہ" کی تفسیر میں انہوں نے لکھا ہے: "وہ ایسے گھر ہوں گے جن میں زندگی نہایت عمدہ ہوگی۔ اللہ نے ان کو موتیوں، سُرخ یاقوت اور سبز زبرجد سے بنایا ہے۔"

(بحارالانوار۔ جلد ۸ صفحہ ۸۹)

تفسیر علی ابن ابراہیمؒ میں امام محمد باقرؑ کی سند سے روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غرفوں (یعنی جنت کے کمروں) کے بارے میں پوچھا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: "اے علیؑ! اللہ نے اپنے دوستوں کے لیے ان گھروں کو موتی، یاقوت اور زبرجد سے بنایا ہے۔ ان کی چھتیں سونے اور چاندی سے بنی ہیں۔ ہر کمرے میں ہزار سنہری دروازے ہوں گے اور ہر دروازے پر ایک فرشتہ متعین ہوگا خدمت کے لیے۔ ان میں حریر و دیباج کے رنگ برنگے بستر ہوں گے۔ جن میں مشک و عنبر اور کافور بھرے ہوں گے۔" ارشاد باری ہے:

"اور بلند بستر ہونگے۔" (بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۱۲۸)

علامہ طبرسیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں کہ "ان لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے (جنت میں) کمرے دیے جائیں گے۔" (سورۂ فرقان۔ آیت ۷۵) یہ تحریر کیا ہے کہ انہیں جنت میں بلند درجہ دیا جائے گا اور کہا گیا ہے کہ یہ کمرے زبرجد، موتی اور یاقوت کے ہوں گے۔

(بحار الانوار۔ جلد ۸ صفحہ ۹۲)

جہنم اور اس کے متعلقات

لفظ جہنم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ عربی کا لفظ نہیں ہے اور اس سے مراد آخرت کی آگ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عربی لفظ ہے اور یہ نام اس کی سخت گہرائی کی وجہ سے پڑا۔ لغت کی کتاب "المصباح" میں کہا گیا ہے کہ یہ لفظ تشدید نون کے ساتھ خماسی (یعنی پنج حرفی الفاظ) سے ملحق ہے اور فارسی زبان سے عربی میں لیا گیا ہے لیکن دوسری کتاب "القاموس" میں کہا گیا ہے کہ "یہ لفظ جہنم مثل عملّس کے ہے۔ اس کے

معنی ہیں نیچی گہرائی والا، اسی وجہ سے آخرت کی آگ کو جہنم کہا گیا۔ اللہ تمام برادران ایمانی کو اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔"

ارشاد ربانی ہے:

"یہ وہی جہنم ہے جس سے تمہیں ڈرایا جاتا تھا۔"

(سورہ یٰسٓ۔ آیت ۶۳)

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچائے رکھو جس کا ایندھن انسان بھی ہوں گے اور پتھر بھی۔ اس پر نہایت سخت و شدید فرشتے متعین ہوں گے جو اللہ کے حکم کی ذرا سی بھی نافرمانی نہیں کریں گے بلکہ وہی کریں گے جس کا ان کو حکم دیا جائے گا۔" (سورہ تحریم۔ آیت ۶)

اور حق یہی ہے کہ یہ آتش جہنم، اس کی سختیاں اور سزائیں، سانپ، بچھو اور دوسری تمام ایذا رساں چیزیں جن سے مجرمین کو ڈرایا گیا ہے، محسوسات جسمانیہ میں سے ہوں گی جیسا کہ تمام اہل شرائع کا اجماع و اتفاق ہے۔ یہ ایذا رساں چیزیں نہ خیالی و مثالی ہوں گی، نہ عقلی و روحانی محض، جیسا کہ حکماء کا خیال ہے۔

ایندھن سے مراد لکڑی ہے اور اس آگ میں مجرم لوگ اور پتھر بطور ایندھن ڈالے جائیں گے۔ جہاں تک پتھر کا تعلق ہے تو اس سے مراد گندھک کا تودہ ہے۔ جس سے آگ کی حرارت اور بھی تیز ہوگی۔ کیونکہ جلنے پر وہ گرم ترین چیز ہوتی ہے جیسا کہ ابن مسعود و ابن عباس کا بیان ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آتش جہنم اور اس کی اذیتوں کا سمجھنا یا تصور کرنا ہماری عقل سے باہر ہے۔ کیونکہ آخرت کی چیزوں کو ہم دنیا کی چیزوں ہی پر قیاس کر سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہاں کی چیزوں سے کہیں زیادہ پُراثر ہیں۔ یہی حال جنت کی نعمتوں کا بھی ہے کہ ہم انھیں بس یہاں کی نعمتوں پر قیاس کر کے سمجھ سکتے ہیں۔ جبکہ جنت کی خوبیوں کے بارے میں کہا گیا ہے' وہ ایسی ہوں گی جن کو نہ ہم میں سے کسی کی آنکھ نے دیکھا ہوگا' نہ کسی کے کان نے سنا ہوگا' نہ ذہن بشر میں ان کا تصور ہی آیا ہوگا۔

امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی: "اور اس دن جہنم کو پیش کیا جائیگا" (سورہ فجر۔ آیت ۲۳) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے میں پوچھا گیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "مجھے روح الامین نے خبر دی ہے کہ اللہ جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ جب اولین و آخرین کو جمع کرے گا تو ایک لاکھ غلاظ و شداد فرشتے ایک ہزار طنابوں سے کھینچ کر جہنم کو میدان حشر میں لائیں گے۔ اس میں سے نہایت خوفناک شور اور لپکے اٹھ رہے ہوں گے۔ اگر اللہ عزوجل نے لوگوں کو حساب کے لیے نہ روکا ہوتا تو وہ ایک ہی لپکے میں سب کو اپنی پیٹ میں لے لیتی۔ پھر اس میں سے گردن کی مانند ایک شعلہ بلند ہوگا جو تمام خلائق کو جن میں نیک و بد شامل ہوں گے اپنے گھیرے میں لے لے گا۔ اس وقت ہر بندۂ خدا خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی' پکارنے لگے گا: "پروردگار! میرا نفس' میرا نفس!" اور میں آواز دونگا: "میری امت' میری امت!" پھر صراط (یعنی وہ راستہ' جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوگا' نصب کیا جائے گا۔

اس پر تین پل ہوں گے۔ ایک پر امانتداری وصلۂ رحمی ہوگی، دوسرے پر نماز ہوگی اور تیسرے پر اس رب العالمین کا عدل ہوگا جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ تب ان تمام لوگوں کو اس پر سے گزرنے کا حکم ہوگا۔ امانتداری وصلۂ رحمی جو مجسم ہوں گی، گزرنے والوں کو روکیں گی۔ اگر وہاں سے نجات مل گئی تو نماز (جو مجسم ہوگی) وہ روکے گی۔ اگر وہاں سے بھی چھٹکارا مل گیا تو پھر رب العالمین کی بارگاہ میں پہنچنا ہوگا۔ اسی کی طرف اس ارشادِ ربانی میں اشارہ ہے:

"یقیناً تمہارا رب کمین گاہ میں ہے۔" (سورۂ فجر۔ آیت ۱۴)

لوگ صراط پر سے یوں گزر رہے ہوں گے کہ کوئی ہاتھ سے لٹکتا ہوگا، کسی کا ایک قدم پھسلا تو دوسرے سے سنبھل گیا۔ ملائکہ اس کے اردگرد پکار رہے ہوں گے: "اے حلیم بخش دے اور درگزر کر دے۔ پھر اپنا فضل کر اور سلامت رکھ۔" لوگ جہنم میں پروانوں کی طرح گر رہے ہوں گے۔

ان حالات میں جو اللہ کی رحمت سے نجات پا کر گزر جائے گا۔ وہ کہے گا: "الحمد للہ اسی کی نعمت سے نیکیاں پوری ہوتی ہیں اور حسنات میں نشوونما ہوتی ہے۔ ساری حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے ناامیدی کے بعد نجات دی اپنے فضل وکرم سے۔ یقیناً ہمارا پروردگار غفور وشکور ہے۔" (بحارالانوار جلد ۸ صفحہ ۶۵)

جناب رسالتمآبؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "جب میں شب معراج براق پر سوار ہوا اور چلا تو میں نے اپنے پیچھے بہت بڑی گھڑگھڑاہٹ سنی، جیسے آسمان زمین پر گر پڑا ہو۔ میں نے جبرئیلؑ سے کہا:

"یہ خوفناک آواز کیسی ہے؟" انہوں نے کہا: "جہنم کے کنارے پر ایک بہت بڑا پتھر تھا، جس کے بارے میں مجھے حکم ہوا کہ اسے جہنم میں ڈال دوں۔ چنانچہ میں نے آج سے ستر سال پہلے اپنے پر سے اسے دھکیل دیا تھا۔ اس وقت وہ جہنم کی تہہ میں پہنچا ہے۔" (انوار نعمانیہ، جزائری صفحہ ۴۷۳)

جہنم میں ایسے ایسے سانپ اور بچھو ہیں جن کی حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ اللہ نے فرمایا: "جب قیامت کا دن ہوگا تو جہنم سے ایک سانپ نکلے گا۔ جس کا نام حریش ہوگا۔ اس کا سر تو ساتویں آسمان پر ہوگا اور اس کی دم زمین کے سب سے نچلے حصے میں ہوگی۔ اس کا منہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوگا اور وہ بلند آواز سے پکار رہا ہوگا: "کہاں ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ و رسول سے محاربہ کیا ہے؟" جبرئیل امین کہیں گے: "اے حریش! تو کس کو ڈھونڈ رہا ہے؟" وہ کہے گا: "میں پانچ قسم کے لوگوں کی تلاش میں ہوں۔ اوّل تارک الصلوٰۃ، دوم مانع زکوٰۃ، سوم شارب خمر، چہارم سود خور اور پنجم وہ لوگ جو مسجدوں میں دنیا کی باتیں کرتے تھے۔"

(انوار نعمانیہ از سید نعمت اللہ جزائری صفحہ ۴۷۳)

اور ارشاد معصوم ہے کہ "جہنم میں ایسے ایسے بچھو ہیں جو موٹے تازے خچروں کی مانند ہیں۔ وہ جس کسی کو ڈسیں گے وہ چالیس برس تک اس کی تکلیف محسوس کرے گا۔" (حوالہ مذکور)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"جب فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان (اپنی پیروی کرنے والوں سے) کہے گا: یقیناً اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا اور اس

کا وعدہ حق ہے اور میں نے تم لوگوں سے وعدہ کیا تو میں نے اس کی خلاف ورزی کی۔ میرا تم لوگوں پر کوئی (جبری) اقتدار نہیں تھا، سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں (اپنی طرف) دعوت دی تو تم نے اسے قبول کر لیا۔ پس تم لوگ مجھ کو ملامت نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں تم کو بچا سکتا ہوں، نہ تم مجھے بچا سکتے ہو۔ میں ان تمام چیزوں سے انکار کرتا ہوں جن میں تم مجھے شریک کرتے رہے ہو، اس سے پہلے۔" (سورہ ابراہیم۔ آیت ۲۲)

اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ جب فیصلہ ہو چکے گا، یعنی اہل جنت اپنی جنت میں جا چکیں گے اور اہل جہنم وہاں داخل ہو چکیں گے تو جہنم کے بیچ میں شیطان کے لیے ایک منبر نصب ہو گا جس پر وہ آگ کی ایک چھڑی لیے ہوئے سوار ہو گا اور کفار اس کے گرد جمع ہو کر اس کو ملامت کر رہے ہوں گے تب وہ ان سے خطاب کرتے ہوئے کہے گا: "یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے، جنہوں نے تم لوگوں کو جنت کی طرف بلایا اور اللہ کا وعدہ حق تھا۔ مگر تم لوگوں نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔ اس کے برخلاف میں نے تم لوگوں کو آتش جہنم کی طرف بلایا اور تمہیں جھوٹی تمنائیں دلائیں تو تم لوگوں نے میری بات مان لی۔ پس اب مجھ کو ملامت نہ کرو بلکہ ملامت تو خود تم پر ہے کیونکہ مجھے تم پر جبر کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا اور تم نے میری دعوت کو اپنے اختیار سے قبول کیا۔ لہٰذا اب آج تم میری مدد کر سکتے ہو نہ میں تمہاری۔ (الانوار نعمانیہ صفحہ ۳۷۴)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ "جب اہل جہنم

اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکیں گے تو وہ تم لوگوں (یعنی شیعیانِ آلِ رسولؐ) کو تلاش کریں گے۔ مگر وہ تم میں سے کسی کو بھی وہاں نہ دیکھیں گے پس وہ آپس میں کہیں گے:

"ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم یہاں ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جنہیں ہم اشرار (یعنی نہایت برے لوگوں) میں شمار کیا کرتے تھے۔ ہم نے ان کا مذاق بنایا ہے یا یہ کہ آنکھیں ان کی طرف سے چکا چوند ہو گئی ہیں؟"

(سورۂ صٓ۔ آیت ۶۲-۶۳)

امامؑ نے فرمایا:

"یقیناً" اہلِ جہنم کی وہ آپس کی لڑائی حق ہے۔"

(سورۂ صٓ۔ آیت ۶۴)

وہ تم لوگوں کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہوں گے ان باتوں کے متعلق جو وہ دنیا میں کہا کرتے تھے۔" (انوارِ نعمانیہ صفحہ ۴۷)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ہی کے متعلق روایت ہے کہ آپ سے ایک شخص نے کہا: "فرزندِ رسولؐ! مجھے خوفِ خدا سے ڈرائیے کہ میرا دل سخت ہو گیا ہے۔"

امامؑ نے فرمایا: "اس طوفانی زندگی میں آخرت کے لیے اپنے کو تیار کرو۔ ایک دن حضرت جبرئیلؑ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یوں آئے کہ وہ کبیدہ خاطر معلوم ہوتے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے آیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سبب پوچھا تو کہا: اے محمدؐ! میں جہنم کی

پھونکنیاں نصب کر کے آیا ہوں۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضاحت طلب کی تو کہا: "اللہ عزوجل نے حکم دیا تو آتش جہنم ہزار سال تک پھونکی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سفید ہو گئی۔ پھر دوسرے ہزار سال تک اسے پھونکا گیا تو وہ سُرخ ہو گئی۔ پھر تیسرے ہزار سال تک اسے پھونکا گیا تو وہ سیاہ ہو گئی۔ پس اب وہ نہایت سیاہ ہے۔ اگر اس کی پگھلی ہوئی آگ کا ایک قطرہ دنیا کے پانی میں پڑ جائے تو تمام اہل دنیا اس کی بدبو سے مر جائیں گے اور جہنم میں ایک وادی ہے جس کا نام "فلس" ہے۔ اس میں ہزار سال تک آگ پھونکی جاتی رہی مگر وہ نہ بھڑکی۔ پھر جب وہ بھڑکی تو اس نے تمام آگ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔"

اگر کوئی یہ کہے کہ مذکورہ دونوں حدیثوں میں بظاہر منافات معلوم ہوتی ہے۔ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش جہنم میں بڑی روشنی ہو گی جس میں اہل جہنم ان لوگوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے جنہیں وہ دنیا میں بڑا سمجھتے تھے، یعنی اہل ایمان کو! اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش جہنم سخت تاریک ہو گی۔ جس میں گندھک کے پتھر جلائے جائیں گے۔ پس وہ سیاہی در سیاہی ہو گی تو میں جواب دوں گا کہ جہنم کے بہت سے طبقے ہیں اور غالباً ہر طبقے کی علیحدہ خصوصیت ہے۔ کہیں روشنی ہو گی تو کہیں تاریکی!

امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے جہنم کے سات درجے بنائے ہیں۔"

(انوار نعمانیہ صفحہ ۴۷۴)

توبہ

حقیقتِ توبہ یہ ہے کہ بندۂ خدا گناہوں کے ارتکاب کے بعد ان نقصانات کا احساس کر کے جو درحقیقت سعادتِ ابدیہ کے لیے مہلک زہر کی حیثیت رکھتے ہیں، نادم و شرمندہ ہو۔ اس طرح وہ بندۂ خدا گناہوں کی آلودگی سے اپنے دل کو پاک کر کے اور آئندہ کے لیے کبھی گناہ نہ کرنے کا عزم کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور ساتھ ہی جن امور کا تدارک ممکن ہوتا ہے ان کا تدارک بھی کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حقیقتِ توبہ بالترتیب تین باتوں سے صورت پذیر ہوتی ہے:

اوّل یہ کہ بندۂ خدا کو اس امر کا علم و احساس ہو کہ گناہوں کے ارتکاب سے آخرت کی زندگی میں ضررِ عظیم اور ہمیشہ کی ہلاکت کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ گناہ اس کے اور اس کے پروردگار کے مابین دوری کا باعث ہوتا ہے اور وہ سعادت سے محروم ہو جاتا ہے۔

دوم یہ کہ ارتکابِ گناہ پر اس کے دل میں تاسف و الم کی کیفیت پیدا ہو۔ کیونکہ گناہ نے اس کے اور اس کے محبوب پروردگار کے درمیان دوری پیدا کر دی۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت اس وقت پیدا ہو گی، جب گناہ کرنے والے کو اس کے نقصانات کا علم و احساس ہو گا۔

سوم یہ کہ مذکورہ حالتوں کے بعد وہ ترکِ گناہ اور تدارک کا عزم بالجزم کرے۔

یہ تینوں باتیں ایک دوسری سے مربوط اور بالترتیب ہیں۔ کیونکہ گناہوں کے نقصان کا علم و احساس، افسوس اور ندامت پیدا کرتا ہے اور

یہی جذبۂ افسوس و ندامت حال و مستقبل میں ترکِ گناہ اور تلافیٔ مافات پر آمادہ کرتا ہے۔ انہی امور کی مجموعی کیفیت کو توبہ کہتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "توبہ اللہ کی رسّی ہے۔ (یعنی رابطہ کا ذریعہ ہے) اور اس کی عنایات کے لیے مدد ہے۔ پس ہر بندۂ خدا کے لیے ہر حال میں ہمیشہ توبہ کرتے رہنا ضروری ہے۔"

علاوہ بریں بندگانِ خدا میں سے ہر طبقے کے لیے جداگانہ سبب توبہ ہوتا ہے۔ پس انبیاء و معصومین علیہم السلام کی توبہ اضطرابِ رموز کے باعث ہوتی ہے۔ اصفیا کی توبہ ذکرِ خدا کے سوا کسی اور چیز سے فرحت کے سبب ہوتی ہے۔ اولیاء کی توبہ خطرات کے رنگ برنگے ہونے سے ہوتی ہے۔ خواص کی توبہ غیر اللہ کے ساتھ مشغول ہونے پر ہوتی ہے اور عوام کی توبہ گناہ کے سرزد ہونے پر واقع ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر طبقے کے افراد کی جداگانہ معرفت ہے۔ جداگانہ علم ہے اور جداگانہ انجام ہے۔ (بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۳۱)

ہر فرد پر توبہ کے واجب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کوئی شخص جب سنِ تمیز و ذمہ کو پہنچتا ہے تو اس کے جسم میں موجود شہوات و عقول یعنی شیاطین اور ملائکہ کے لشکروں کے درمیان آویزش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پھر قوتِ شہوت و غضب اور تمام بری صفات کے تکمیل کو پہنچنے کے بعد ہی قوتِ عقل تکمیل پاتی ہے۔ بالآخر اس نزاع میں عقل اور شریعت کے غلبے کی بنا پر اللہ کے لشکر کو شیطان کے لشکر پر فتح حاصل ہوتی ہے۔ تب نفسِ انسانی پسندیدہ صفات اور اللہ کی عبادت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ پس وجوبِ توبہ کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ نفسِ انسانی نیکی

کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

ایک بندے پر توبہ کے واجب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بندہ اپنے اعضاء و جوارح کے گناہ میں ملوث ہونے سے مبرا نہیں ہے۔ اگر وہ کسی وقت اعضائے بدن کے گناہ سے مبرا ہو جائے تو بھی وہ نفس کی برائیوں اور دل کے قصد گناہ سے محفوظ نہیں۔ پھر اگر وہ قصد گناہ سے مامون ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہٹانے والے شیطانی وسوسوں سے مبرا نہیں۔ اگر شیطانی وسوسوں سے بچ جائے تو اللہ کی ذات وصفات کے متعلق علم حاصل کرنے میں جو کوتاہی وغفلت واقع ہو جاتی ہے اس سے انسان کبھی بھی مبرا نہیں ہو سکتا۔ پس اس قسم کا ہر نقص انسان کو خود سے دُور کرنا اور اس سے مراجعت کرنا چاہیے اور اسی کا نام توبہ ہے۔

چونکہ ہر انسان اس قسم کے کسی نہ کسی نقص کا شکار رہتا ہے لہٰذا ہر انسان پر اس کے حال کے مطابق توبہ واجب ہے۔ اگر کوئی بندہ کسی لحظہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کی حالت میں نہ رہے اور اس کو موت آجائے تو اس کی رُوح کا بلا توبہ کے نکلنا لازم آئے گا۔ کیونکہ کوئی بندہ موت سے پہلے ایک لحظہ کے لیے بھی مذکورہ بالا گناہوں میں کسی ایک سے مبرا نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر بندہ کے لیے ہر حال میں توبہ کرنا واجب ہے۔

بعض عارفوں کا ارشاد ہے: اگر کوئی عاقل انسان اپنی بقیہ زندگی میں اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بغیر گزری ہوئی عمر پر پچھتاوے کے آنسو نہ بہائے تو اس کا یہ عمل اس کو بدتر موت کی طرف کھینچ لے جائیگا۔ یعنی ایک عاقل کی باقیماندہ عمر اس کے ماضی کی جہالت میں گزری ہوئی

عمر کے مثل کس طرح ہو سکتی ہے ؟ اسے ماضی سے عبرت حاصل کر کے مستقبل کو آراستہ کرنا چاہیے۔

جس نے اپنی عمر کی قدر اور اس کے فائدے کو پہچان لیا، لیکن اس سے سعادت ابدی حاصل نہیں کی ہے، وہ یہ احساس کر لیتا ہے کہ توبہ کے بغیر گناہ میں گزری ہوئی عمر اس کے لیے کتنی حسرت اور ندامت کا باعث ہے کیونکہ اگر کسی عقلمند آدمی کو کوئی بیش قیمت جوہر مل جائے اور وہ اسے ضائع کر دے تو وہ اس پر یقیناً روتا ہے۔ پھر اگر یہ ضیاع اس کی ہلاکت کا سبب بھی بن جائے تو اس کا رونا اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے اس کی ہر سانس ایک قیمتی جوہر ہے۔ اس کی زندگی کے علاوہ کوئی اور چیز انسان کو سعادت ابدی تک پہنچانے اور شقاوت سرمدی سے نجات دلانے والی نہیں ہے۔ جس نے اپنی زندگی کو غفلت میں گنوا دیا وہ ظاہری خسارت کا شکار ہوا اور جس نے اس کو معصیت میں گزارا اس کو ہلاکت ابدی نے نگل لیا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے کو دوبارا الہام کرتا ہے۔ پہلی بار اس وقت جب وہ بطن مادر سے نکلتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے : اے میرے بندے! میں نے تجھ کو دنیا میں پاک و صاف بھیجا اور میں نے تجھے یہ زندگی امانت کے طور پر عطا کی ہے۔ پس میں دیکھوں گا کہ تو اس امانت کی حفاظت کس طرح کرتا ہے اور کس حال میں میرے ساتھ ملاقات کرے گا۔ دوسری بار روح نکلنے کے وقت کہا جاتا ہے: اے میرے بندے! کیا تو نے میری دی ہوئی امانت کو اچھی طرح رکھا ؟ کیا تو نے اس کی حفاظت کی؟ حتیٰ کہ وعدہ کے مطابق میرے پاس آیا، تاکہ تجھ سے وفائے عہد

کیا جائے یا تو نے اس امانت کو ضائع کیا اور اب تجھ پر باز پرس اور عذاب ہے۔
اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"تم میرے عہد و اقرار کو پورا کرو تو میں بھی تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۰)

نیز ارشاد ربانی ہے:

"جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں۔"
(سورہ مومنون۔ آیت ۸)

روایت کی گئی ہے کہ جب ملک الموت کسی انسان کی روح قبض کرنے آتا ہے تو وہ اس کو بتاتا ہے کہ اب تمہاری زندگی ایک ساعت باقی ہے اور اس کے ختم ہونے میں کسی طرح کی تاخیر ممکن نہیں۔ اس بات سے اس شخص کو حسرت اور غمگینی لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ جینے کی ایک گھڑی بھر کی مہلت ملنے پر دنیا کی ساری نعمتیں چھوڑ دینے کو تیار ہو جاتا ہے تاکہ اس تھوڑے سے عرصے میں کوئی نیک عمل بجا لا سکے، حالانکہ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا۔

یہ روایت بھی ہے کہ جب کسی قریب المرگ انسان کی آنکھوں سے ظاہر کا پردہ ہٹ جاتا ہے تو وہ ملک الموت سے عرض کرتا ہے کہ "مجھے ایک دن کی مہلت دی جائے تاکہ میں اپنے پروردگار کے حضور عذر خواہی کروں، توبہ کروں اور اپنے لیے عمل صالح کروں یعنی کچھ توشہ آخرت حاصل کروں۔" ملک الموت جواب دیتا ہے: "تو نے اپنی زندگی کے بہت سے ایام ضائع کر دیے۔ لہٰذا اب کوئی دن تجھ کو مہلت کے طور پر نہیں ملے گا۔" پھر وہ کہتا ہے: مجھے ایک گھنٹہ کی مہلت ہی دی جائے۔

ملک الموت جواب دیتا ہے: تو نے اپنی زندگی کے بہت سے گھنٹے ضائع کر دیے لہٰذا اب تجھے ایک لمحے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ تب اس پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے حلق سے غرغر کی آواز آنا شروع ہو جاتی ہے اور اس کی سانس رکنے لگتی ہے۔ وہ اپنی عمر ضائع کرنے کی ندامت اور اپنی ناکامی پر حسرت کے غم میں تڑپنے لگتا ہے۔ اس خوفناک حالت میں اس کا اصل ایمان بے قرار ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کی جان نکل جاتی ہے۔ اگر خدائی رحمت اس کی طرف بڑھی اور اس کی روح توحید پر نکلی تو اسی کا نام حسن خاتمہ ہے۔ اگر اس کی شقاوت کے مطابق اس پر غضب آیا' اس کی روح شک و شبہ اور بے قراری کی حالت میں رخصت ہوئی تو اس کا نام سوئِ خاتمہ ہے۔[1]

پس اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ توبہ کبھی تو شریعت کی رو سے واجب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ کوئی بندہ محرمات اور ترک واجبات کا مرتکب ہو۔ بعض صورتوں میں توبہ شرعاً واجب نہیں ہوتی۔ تاہم ضروری ہوتی ہے جیسا کہ دل میں برے خیالات کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو سمجھنے میں کوتاہی کرنے پر توبہ ضروری ہوتی ہے۔ جامع السعادات کی طرح بہت سی کتابوں میں انبیاءؑ کے استغفار اور توبہ کے متعلق جو بیان آتا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ استغفار دوام ذکر الٰہی کو ترک کرنے اور شہود و استغراق کے مقام سے غفلت برتنے کے سبب سے ہے۔ یعنی ہماری طرح گناہوں میں محو رہنے کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ مباح کاموں میں مشغول ہونے کے باعث توبہ اور طلب مغفرت کرتے ہیں۔

---

[1] جامع السعادات جلد ۳ صفحہ ۹۰

عمومی حکم توبہ پر مشتمل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

" اور تم سب لوگ اللہ کی توبہ کرو "

(سورۂ نور - آیت ۳۱)

اس حکم میں تمام انسانوں کے شامل ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ البتہ انبیاء و اوصیاء کے لیے دوام ذکر الٰہی سے کبھی کسی قدر غفلت یا بعض مباحات میں مشغولیت ہی باعث توبہ بن جاتی ہے۔ اسی لیے وارد ہوا کہ نیکو کار لوگوں کے لیے جو چیزیں حسنات کا درجہ رکھتی ہیں وہ مقربین کے لیے سیئات کے درجے میں ہوتی ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر رات و دن میں سو مرتبہ اللہ کی طرف توبہ و استغفار کرتے تھے بغیر کسی گناہ کے، اور یقیناً اللہ اپنے اوصیاء کو مصائب سے دوچار کراتا ہے انہیں اجر دینے کے لیے۔ حالانکہ ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ ایسا اس لیے ہے کہ لفظ "ذنب" ہر ایک کی قدر و منزلت کے اعتبار سے اس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے انبیاء اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنے لیے "ذنب یا ذنوب" (بحالت جمع) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ کیونکہ ان کی پاکیزگی اور نورانیت کے اعتبار سے ایک لمحے کے لیے بھی ذکر و توبہ الی اللہ سے برائے نام غفلت بھی ان کے نزدیک انکا قصور قرار پاتی ہے اور اس کے لیے وہ توبہ استغفار کرتے ہیں۔"

(حق الیقین صفحہ ۱۹۷)

واضح رہے کہ توبہ کرنے کا وجوب تمام، ادلہ اربعہ یعنی آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ معصوم، اجماع مشروط اور دلائل عقلیہ سے ثابت ہے۔

جہاں تک آیات کا تعلق ہے تو ارشاد ربانی ہے:

"اور تم سب توبہ کرو اللہ کی طرف اے ایمان والو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" (سورۂ نور۔ آیت ۳۱)

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی طرف نصیحت آمیز توبہ کرو۔ ممکن ہے کہ تمہارا پروردگار تمہاری برائیوں کا تمہاری طرف سے کفارہ ادا کر دے۔"

(سورۂ تحریم۔ آیت ۸)

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں صریحاً امر توبہ موجود ہے اور نصیحت آمیز توبہ سے مراد ایسی توبہ ہے جو خالصتہً لوجہ اللہ اور دوسرے تمام اغراض سے خالی ہو۔ نہ مال وجاہ کا لالچ ہو نہ کسی قسم کا خوفِ خلق ہو۔

علاوہ بریں یہ قولِ باری تعالیٰ بھی توبہ ہی کے بارے میں ہے:

"کہہ دیجیے کہ اے میرے وہ بندو، جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یقیناً اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ کیونکہ وہ بہت بڑا بخشنے والا اور مسلسل رحم کرنیوالا ہے۔" (سورۂ زمر۔ آیت ۵۳)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر اتمام حجت بھی ہے، توبہ کی ترغیب بھی ہے اور قبولیت دعا کا وعدہ بھی۔ وہ اس طرح کہ اللہ نے لوگوں کو اپنے بندوں کی حیثیت سے آواز دی ہے اور بندوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے آقا کی اطاعت کریں۔ اسی کے ساتھ رشتہ عبدیت اللہ کی رحمت و مغفرت کی طرف رغبت بھی دلاتا ہے۔ آیت کریمہ

میں گناہ کرنے کو لفظ "اسراف" سے پیش کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں حد سے گزر جانا اور چونکہ گناہوں کا ارتکاب حدود عبدیت سے گزر جانا ہے۔ لہذا وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ رہی یہ بات کہ خطاب تمام انسانوں سے ہے یا مومنین سے؟ تو یہ مقام اس امر کی تحقیق کا نہیں ہے۔ پھر یہ فرمان کہ "تم مایوس نہ ہو اللہ کی رحمت سے" تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد آخرت کی رحمت ہے اور یہ رحمت مغفرت کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ جیسا کہ مغفرتِ ذنوب کے وعدے سے ثابت ہے۔

(تفسیر المیزان جلد ۷ صفحہ ۲۹۵)

ان آیتوں کے علاوہ دوسری آیتوں سے بھی توبہ کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو تفسیر مجمع البیان میں امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ قول منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "قرآن مجید میں اس آیت سے زیادہ وسعتِ رحمت و مغفرت رکھنے والی کوئی اور آیت نہیں جس میں اللہ نے فرمایا ہے: "اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم و اسراف کیا ہے' الخ" اور تفسیر المیزان میں ہے کہ تفسیر درمنثور میں ابن سیرین کے حوالے سے حضرت علی علیہ السلام ہی کا یہ قول منقول ہے کہ وہ فرمان الٰہی اس سے بھی زیادہ امید افزا ہے:

"اور یقیناً عطا کرے گا آپ کا رب آپ کو تو آپ راضی ہو جائیں گے۔" (سورۂ ضحیٰ۔ آیت ۵)

اسی تفسیر درمنثور میں احمد ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی کے حوالوں سے ثوبان کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ص

کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "مجھے دنیا اور اس کے جملہ خزانوں سے محبوب تر یہ آیت ہے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم و اسراف کیا ہو الخ۔" پس ایک شخص نے کہا: "اگر وہ مشرک ہو تب بھی؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قدرے خاموش رہے، پھر فرمایا: "سوائے اس شخص کے جو مشرک ہو۔" میں کہتا ہوں کہ اس روایت میں کہیں سے کچھ سہو واقع ہوا ہے۔ کیونکہ یہ امر پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس آیت میں گناہ شرک بھی شامل ہے۔ بشرطیکہ اس کے بعد توبہ کر لی جائے۔ (تفسیر المیزان جلد ۱۷ صفحہ ۲۸۴)

نیز تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ ایک قول کی بنا پر یہ آیت: "اے میرے وہ بندو الخ" قاتل حمزہؓ "وحشی" کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ اس نے اسلام لانے کا ارادہ کیا۔ مگر اسے یہ خوف لاحق تھا کہ اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ مسلمان ہوگیا۔ تب یہ کہا گیا: "یارسول اللہ! یہ آیت اسی کے لیے بالخصوص نازل ہوئی ہے یا تمام مسلمانوں کے لیے؟" تو آپ نے فرمایا: "تمام مسلمانوں کے لیے۔"

ابن طاؤس علیہ الرحمہ کی کتاب "سعد السعود" میں تفسیر کلبی کے حوالے سے منقول ہے کہ وحشی اور مشرکین کے چند دوسرے لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کی طرف پیغام بھیجا کہ ہمیں آپ کا دین قبول کر لینے میں بس یہ امر مانع ہے کہ آپ اپنی کتاب (یعنی قرآن مجید) میں پڑھتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو بھی پکارتا ہے، کسی کو (ناحق) قتل کر دیتا ہے اور زنا کا مرتکب ہوتا ہے، وہ گناہ سے دوچار

ہوتا ہے' وہ ہمیشہ کے لیے عذاب میں رہے گا۔ جبکہ ہم لوگوں نے یہ تمام جرائم کیے ہیں۔" پس پیغمبر اکرمؐ نے ان کے جواب میں یہ ارشاد خداوندی بھیج دیا: "مگر وہ جو توبہ کرے' ایمان لائے' اور عمل صالح کرے۔" ان لوگوں نے دوبارہ پیغام بھیجا: "ہمیں خوف ہے کہ ہم عمل صالح نہ کر سکیں گے۔" تب نبی کریمؐ نے یہ فرمان الٰہی ان کی طرف روانہ کیا: "یقیناً اللہ اس (جرم) کو نہیں معاف کرے گا کہ اس کا کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے علاوہ دوسرے گناہوں کو اللہ بخش دے گا جس کے لیے وہ چاہے گا۔" انہوں نے پھر یہ کہا: "ہمیں خوف ہے کہ ہم اس مشیئت (یعنی چاہنے) میں شامل نہ ہوں۔" تو حضور اکرمؐ نے ان کی طرف یہ آیت بھیج دی: "اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم و اسراف کیا ہے الخ۔" اس کے بعد وہ لوگ آئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ آنحضرتؐ نے وحشی سے کہا: "تم میری نگاہوں سے دور رہو کہ میں تمہاری طرف دیکھنا پسند نہیں کرتا۔" چنانچہ وہ شام چلا گیا اور مقام خمر[1] یا شراب نوشی سے مر گیا۔ (المیزان جلد ۷، صفحہ ۳۰۲)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت "اللہ کے لیے توبہ قبول کرنا تو بس ان لوگوں کے لیے ہے جو نادانستہ برائی کر بیٹھتے ہیں اور

---

[1] اگر یہ مقام کا نام ہے تو اس کا تلفظ "خمر" ہے جو مدینے کے قریب ایک گاؤں ہے لیکن غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے اور صحیح لفظ "حمص" ہے یا اگر لفظ "خمر" بمعنی شراب ہے تو بھی درست ہو سکتا ہے کیونکہ یہ شخص شرابی تھا اور کئی مرتبہ اسے سزا بھی مل چکی تھی۔

پھر وہ جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۱۷) کے بارے میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "ہر وہ بُرائی جسے کوئی بندۂ خدا کرتا ہے وہ جہالت اور نادانستگی ہی ہے، چاہے وہ اسے عمداً ہی کیوں نہ کرے کیونکہ وہ جہالت ہی ہے جو کسی کو گناہ کی دعوت دیتی ہے اور اسے اس کی نگاہ میں خوبصورت بناتی ہے" اور "جلد ہی توبہ کر لینے" کا مطلب یہ ہے کہ موت سے پہلے ہی توبہ کرے۔ کیونکہ انسان اور اس کی موت کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ قریب ہی کا فاصلہ ہے۔ لہٰذا یقیناً موت سے پہلے جو توبہ کر لی جائے وہ مقبول ہوتی ہے۔"

اور امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "گناہوں سے توبہ کر لینے والا اس کی مانند ہے جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو اور گناہ اور استغفار ساتھ ساتھ کرنے والا مذاق اڑانے والے کی مانند ہے۔" امامؑ ہی نے فرمایا: "جب بھی مومن توبہ و استغفار کے ذریعہ خدا کی طرف لوٹتا ہے، اللہ اس پر مغفرت کے ذریعہ کرم فرماتا ہے۔ وہ غفور و رحیم ہے، توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر کرتا ہے۔"

(سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۱۲۶-۱۲۷)

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں فرمایا: جو شخص اپنی موت سے ایک سال پہلے توبہ کرے، اللہ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ پھر آنحضرتؐ نے فرمایا: "سال تو زیادہ ہے جو ایک ماہ پہلے توبہ کرے، اللہ اس کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے۔" پھر آپ نے فرمایا: "مہینہ بھی زیادہ ہے، جو شخص اپنی موت سے ایک جمعہ پہلے توبہ کرے اللہ اس کی توبہ بھی قبول کر لیتا ہے۔" پھر فرمایا: "ایک جمعہ بھی زیادہ

ہے۔ جو شخص ایک دن پہلے توبہ کرے، اللہ اس کی توبہ بھی قبول کر لیتا ہے۔"
پھر فرمایا: "ایک دن بھی زیادہ ہے، جو ایک ساعت پہلے توبہ کرلے اللہ
اس کی توبہ بھی قبول کرتا ہے۔" پھر فرمایا: "ایک ساعت بھی زیادہ ہے، جو
اس وقت بھی توبہ کرے، جب اس کی جان حلقوم تک پہنچ گئی ہو، تب
بھی اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔" (من لا یحضرہ الفقیہ جلد ا صفحہ ۷۹)۔

ثعلبی نے بھی عبادہ ابن صامت کی سند سے اسی حدیث کو معمولی
اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے[1] (بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۱۶)

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے تحریر کیا ہے: "بعض مفسرین کا قول ہے
کہ یہ بھی اللہ جل شانہ، کے اس کے بندوں پر الطاف میں سے ہے کہ وہ
روح قبض کرنے والے فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ وہ پیروں کی انگلیوں سے
روح نکالنا شروع کرے اور آہستہ آہستہ سینے تک پہنچے پھر حلق تک
آئے تاکہ اس مہلت میں مرنے والا اپنے دل سے اللہ کی طرف متوجہ
ہو جائے، وصیت کرے، ملک الموت کو دیکھنے سے پہلے توبہ کرلے،
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ورد کرے اور اللہ کو یاد کرتا رہے۔ یہاں تک کہ اس
کی روح جسم سے نکلے تو اس کی زبان پر اللہ کا ذکر ہو اور اس کا خاتمہ
بالخیر ہو۔" ہم سب کو اللہ اپنے احسان و کرم سے اس امر کی توفیق عطا
فرمائے۔" (بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۱۶)

---

[1] علامہ مجلسی نے اس حدیث کے بارے میں کچھ توقف فرمایا ہے اور
اس سے مراتب توبہ کو مراد لیا ہے اور فرمایا ہے کہ حالت نزع کی توبہ
صرف اضطراری حالت میں قبول ہو سکتی ہے۔

اور دعوات الراوندی میں ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: اللہ اپنے بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا رہتا ہے۔ جب تک اس کا دم حلق تک نہ آجائے۔ لہٰذا اے لوگو! اپنے رب کی طرف توجہ کرو' موت سے پہلے نیک اعمال کی طرف جلدی کرو' دوسری مشغولیتوں سے پہلے اور اپنے رب کے ساتھ اپنا رشتہ قائم رکھو' اس کا بار بار ذکر کر کے۔

(بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۱۹)

امام جعفر صادق یا امام محمد باقر علیہما السلام کا ارشاد ہے: حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں مناجات کی: "پروردگار! تو نے مجھ پر شیطان کو مسلط کیا اور اسے رگ و پے میں خون کی گردش کی طرح روانی عطا کی' لہٰذا مجھے اس کے دفاع میں کچھ عطا فرما۔"

رب العزت نے فرمایا: "اے آدمؑ! میں تمہیں اس کے دفاع میں یہ دے رہا ہوں کہ تمہاری ذریت میں سے جو کوئی کسی برائی کا ارادہ کرے گا تو وہ اس کے نامۂ اعمال میں نہیں لکھی جائے گی۔ پھر اگر وہ اس کا ارتکاب کرے گا تو صرف ایک ہی گناہ لکھا جائے گا۔ لیکن جو کوئی کسی نیکی کا ارادہ کرے گا تو چاہے وہ اس پر عمل نہ کرے' اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دی جائے گی اور اگر وہ اس پر عمل کرے گا تو اس کے لیے دس نیکیوں کا ثواب لکھا جائے گا۔"

حضرت آدمؑ نے عرض کی: "پروردگار! کچھ اور بھی عطا فرما۔"

پروردگار نے فرمایا: "میں تمہیں یہ رعایت بھی دیتا ہوں کہ تمہاری ذریت میں سے جو شخص کوئی برائی کرے گا اور پھر طلب مغفرت کرے گا تو میں اسے بخش دوں گا۔"

حضرت آدمؑ نے درخواست کی: "پالنے والے! کچھ اور بھی کرم!" تو ارشاد ربانی ہوا: "میں نے ان کے لیے توبہ کا در کھول دیا ہے یا یہ ارشاد ہوا: میں نے ان کے لیے توبہ میں اتنی وسعت دیدی ہے کہ جب تک دم گلے میں نہ آجائے اس کی گنجائش رہے گی۔" حضرت آدمؑ نے کہا: "پروردگار! اب کافی ہے۔" (الکافی جلد ۲ صفحہ ۴۴۰ طبع ایران)

اور امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: شیطان ہمارے دوستوں کے پاس ان کی نزع کے وقت داہنے یا بائیں ہاتھ سے آکر انھیں گمراہ کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ مگر اللہ ان کو محفوظ رکھتا ہے۔ اسی امر کی جانب اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے، اپنے اس قول میں:

"اللہ ثابت قدم رکھتا ہے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں قولِ ثابت کے ذریعے زندگانی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔" (سورۂ ابراہیمؑ۔ آیت ۲۷) [1]

اور آنجناب ہی کا ارشاد ہے: ملک الموت سے پوچھا گیا: آپ لوگوں کی روحوں کو ایک ہی ساعت میں کیسے قبض کرتے ہیں جبکہ ان میں سے بعض مغرب میں ہوتے ہیں تو بعض مشرق میں ہوتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: میں روحوں کو بلاتا ہوں تو وہ میری طرف آجاتی ہیں۔ ساری دنیا میرے سامنے اسی طرح سے ہے جیسے تم میں سے کسی کے سامنے کوئی پیالہ ہوتا ہے کہ وہ اس میں سے جہاں سے چاہتا ہے لے لیتا ہے یا یوں کہ جیسے کسی کے ہاتھ میں کوئی درہم ہو جسے وہ

---

[1] من لایحضرہ الفقیہ جلد ۱ صفحہ ۸۱

جیسے چاہے اللہ پلٹتا رہتا ہے۔ (من لایحضرہ الفقیہ جلد ا صفحہ ۸۱)

جہاں تک وجوب توبہ میں انعقاد اجماع کا تعلق ہے تو جاننا چاہیے کہ اس میں کوئی کلام نہیں ہے۔ رہا دلیل عقلی کا معاملہ تو اس ضمن میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ جس کو توبہ اور اس کے وجوب کے معنی معلوم ہو جائیں۔ اس کے لیے وجوب توبہ میں شک وشبہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کے احسان وکرم سے حسن خاتمہ کی دعا کرتے ہیں اور تمام حالات میں ساری حمد بس اللہ ہی کے لیے ہے۔ پھر درود اور سلام ہے نبیؐ رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے پاک اہلبیتؑ پر۔

اسلام

دینِ فطرت

موجودہ دور کی سریع اور محیر العقول سائنسی ترقی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انسان یہ سمجھنے لگا ہے کہ اب اسے مذہب کی حاجت نہیں رہی۔ اس کے خیال کے مطابق مذہب پر مبنی نظام ایک ایسی فرسودہ چیز ہے جس پر عمل درآمد محض تضیع اوقات ہے اور یہی وہ خام خیالی ہے جس نے عصرِ حاضر کے انسان کو گوناگوں مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب میں مذہب کی ضرورت اور افادیت اور دینِ اسلام کی حقانیت کا مختصر لیکن واضح نقشہ پیش کیا گیا ہے تاکہ بنی نوعِ انسان کے اذہان کو مادہ پرستی اور لامذہبیت کے چنگل سے نجات ملے اور وہ سائنس کی پیش رفت، توحید پرستی اور اسلام کی حیات بخش تعلیمات کی ہم آہنگی کا ادراک کر سکیں۔ چنانچہ اس کتاب میں اسلامی اصولوں اور نظریات کی صحت کی معقول اور مدلل بنیاد فراہم کی گئی ہے۔

اس کتاب میں جن عنوانات سے بحث کی گئی ہے ان میں مذہب اور انسانی زندگی، اسلام کے بنیادی عقائد، حیات بعد از ممات، انبیائے کرامؑ کا مشن اور کردار، اسلامی تعلیمات، اسلامی نظم و نسق کا بنیادی معیارِ عمل اور پیشوایانِ اسلام کے مختصر سوانح حیات وغیرہ شامل ہیں۔ اُمید ہے ان مطالب کے مطالعے سے قارئینؑ کو نہ صرف غور و فکر کا موقع ملے گا بلکہ روحانی سکون بھی حاصل ہوگا اور وہ محسوس کریں گے کہ یہ کتاب ایک ایسی روشن مشعل ہے جو ان کی رہنمائی فلاح و نجات کی صراطِ مستقیم کی جانب کرتی ہے۔

اسلام

دینِ معرفت

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب اسلام کے مختلف احکام سے بحث کرتی ہے جو انسان کی دینی اور دُنیاوی فلاح کا موجب ہیں۔

انسان فطری طور پر اچھائی سے محبت اور بُرائی سے نفرت کرتا ہے اور بُرے کام کرنے والوں کو حتی الامکان سزا بھی دیتا ہے۔ ہر ملک کے قوانین وضوابط اور عدالتی ادارے اِس حقیقت کے شاہد ہیں۔

بدقسمتی سے انسان کے بنائے ہوئے اصول و قوانین میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ وہ ایک یا چند اشخاص کے دماغوں کی اختراع ہوتے ہیں اور چونکہ انسانی عقل محدود ہے اور اس کے فیصلے اکثر ذاتی پسند اور ناپسند یا وقتی مصالح کی بنیاد پر ہوتے ہیں اِس لیے ان میں توازن اور استواری کا فقدان ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کے قوانین میں آئے دن ترمیم ہوتی رہتی ہے۔

اس کے برعکس چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس علیم، خبیر اور عالمِ کُل ہے اِس لیے اُس کے وضع کردہ قوانین مکان و زمان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور ان میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی اور یہ امتیاز فقط دینِ اسلام کو حاصل ہے کہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اور پیشوایانِ دین کے ارشادات جو درحقیقت احکامِ الٰہی ہی کی تفسیر ہیں قرآن مجید اور احادیث کی شکل میں محفوظ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب دو جلدوں میں منقسم ہے اور ہر جلد میں احکامِ اسلامی کے مختلف عنوانات قائم کر کے ہر ایک سے الگ الگ بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی تیاری میں جن مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے حوالے حاشیے میں درج ہیں۔

اُمید ہے مختلف مسائل کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لیے یہ کوشش مفید ثابت ہو گی۔

اسلام

دینِ حکمت

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان 'اسلام دینِ فطرت' 'اسلام دینِ معاشرت' اور 'اسلام دینِ معرفت' کے بعد اس سلسلے کی چوتھی کتاب 'اسلام دینِ حکمت' قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہے۔

'اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے'! یہ جملہ تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعے اکثر و بیشتر سننے میں آتا ہے لیکن اس کی توضیح و تشریح بہت کم کی جاتی ہے۔ موجودہ کتاب کی غرض و غایت اسی جملے کی تشریح ہے چنانچہ اس میں اسلام کے نقطۂ نگاہ سے انسان کی زندگی کے بیشتر روحانی اور مادی پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور جہاں ایک طرف ایمان، جہانبینیٔ اسلام، توحیدِ الٰہی، خودسازی، جہاد، تقویٰ، اسلام کے اجتماعی نظام اور خلافت اور امامت جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے وہاں ازدواج، ملکیت اور قضاوت جیسے فقہی مسائل اور اسلامی اخلاقیات کے اصول و مبادی بھی بالتفصیل بیان کیے گئے ہیں اور یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ گوناگوں اسلامی موضوعات اور مسائل پر مبنی اتنی جامع کتاب آج تک پیش نہیں کی گئی۔

یہ کتاب اسلام شناسی پر ایک مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے مطالعے سے ایک قاری کو دینِ اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات کی جانب رہنمائی حاصل ہو جائے گی اور وہ اس قابل ہو جائے گا کہ مختلف دینی موضوعات پر مزید تحقیق کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ

ہماری مطبوعات

اسلام دینِ فطرت

اسلام دینِ معاشرت

اسلام دینِ معرفت

اسلام دینِ حکمت

فلسفۂ معجزہ

فلسفۂ شہادت

فلسفۂ ولایت

فلسفۂ حجاب

فلسفۂ احکام

تاریخِ عاشوراء

گفتارِ عاشوراء

بنائے کربلا

مرگِ گُل رنگ

مکتبِ اسلام

مکتبِ رسولؐ

مکتبِ تشیّع

آخری فتح

انتظارِ امامؑ

توضیح المسائل اردو

توضیح المسائل فارسی

شریعت کے احکام

کتابُ الدعاء والزیارات

اعمالِ حج

حکایاتُ القرآن

حیاتِ انسان کے چھ مرحلے

مقالاتِ مطہری

بُت شکن

مَردِ انقلاب

ہار جیت

بہلول عاقل

فُزتُ بِرَبِّ الکعبۃ

سخن

ابوطالب۔ مظلومِ تاریخ

تفسیر سورۂ حمد

شرحِ قرآن

سیر و سلوک

یسّرنا القرآن

غدیر کی برکتیں

تعلیماتِ اسلامی

حدیثِ کساء

دعائے کمیلؑ

نیز بچّوں کے لیے دل چسپ مذہبی کہانیاں بھی دستیاب ہیں!